ملاقات

(افسانوں کا مجموعہ)

اومکار کول

وتستا پبلکیشنز، جموں

مُلاقات

(افسانوں کا مجموعہ)

اومکار کول

مترجم

عبدالمغنی

وتستا پبلکیشنز، جموّں

© اومکار کول

2006

پبلشر:

وِتستا پبلیکیشنز

472، وِنا یک نگر، مُٹھی،

جموں - 181205

ڈی۔ٹی۔پی:

رِنکو کول

IILS D.T.P CENTRE

M.No.: 94191-36369

قیمت: Rs.150

پریس:

رادھا پریس، کیلاش نگر، دہلی -110031۔

فہرست

دو لفظ

افسانے میں اپنے طالب علمی کے زمانے سے لِکھتا رہا ہوں۔ 1960 سے 1963 کے دوران لِکھے گئے افسانے کشمیر کے میرے آبائی گاؤں بوگام (کولگام) میں 1990 میں آگ کی نذر ہو گئیں۔

اکتوبر 1963 میں ایم۔اے کرنے کے بعد میں اپنا گھر گاؤں چھوڑ کر دلّی آیا۔ میرا پہلا افسانہ "ٹیوشن" دلّی کے ایک ادبی رسالہ میں 1964 میں شائع ہوا۔ آگرہ میں اپنے قیام کے دوران (1967-1964)ء میں ریسرچ کرنے کے ساتھ ساتھ بیچ بیچ میں افسانے لکھتا رہا جن میں کچھ مقامی رسالوں میں شائع بھی ہوئے۔

امریکہ میں قیام کے دوران (1971-1968)اور بھارت لوٹنے پر پٹیالہ (1987-1971) میں زیادہ تر لسانیات اور تدریسِ زبان کے موضوع سے وابستہ ہو گیا۔ تدریس اور انتظامی امور میں مصروفیت کی وجہ سے میں نے بہت ہی کم افسانے لکھے۔

مسوری میں اپنے قیام کے دوران (1994-1987) پھر سے افسانے لکھنے کی طرف دلچسپی پیدا ہوئی۔ شاید چاروں طرف کے فطری مناظر اور پہاڑی ماحول سے مجھے تحریک ملی ہو۔ کچھ افسانے میسور میں اپنے قیام کے دوران (2000-1994) میں لِکھے۔

''ملاقات'' نام سے میرا پہلا افسانوی مجموعہ ہندی میں 2001 میں چھپا۔ بھارت سرکار کی طرف سے 2003 میں اس مجموعے کو انعام سے نوازا گیا۔ یہ انعام اُس وقت کے وزیر اعظم شری اٹل بہاری واجپائی کے ہاتھوں دِیا گیا۔ اس مجموعے میں درج افسانوں کی ادبی دُنیا میں چرچا ہوئی۔ اِس میں سے منتخب افسانے کئی امریکی اور یورپی یونیورسٹیوں میں ہندی زبان کی تدریس میں بھی استعمال ہونے لگے۔ اس سے میری حوصلہ افزائی ہوئی۔

کُچھ کشمیری زبان دانوں کے اصرار پر شری پیارے ہتاش نے اس مجموعے کا کشمیری ترجمہ کیا جو 2003 میں چھپ گیا۔ اس کا پیش لفظ کشمیری زبان کے جانے مانے تنقید نِگار جناب محمد یوسف ٹینگ نے لِکھا اور انہوں نے اس میں درج افسانوں کو سراہا۔

اپنے افسانوں کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ پھر اُن افسانوں کے بارے میں جو کچھ لمحوں، واقعوں یا ِکرداروں کی لمانت ہوں۔ بہت سے افسانے کسی بھی روایتی اصطلاح میں بندھ نہیں جاتے۔ یہ افسانے رنگارنگ واقعوں، ِکرداروں اور تجربوں سے جُڑے ہیں۔ کئی افسانے چھوٹے ہیں جو "مختصر" افسانوں کی اصطلاح میں بھی مکمل طور پر سماتے نہیں۔ میرے خیال میں افسانہ نہ چھوٹا ہوتا ہے اور نہ لمبا۔ افسانہ موضوع کو اُتنے ہی لفظوں میں بیان کرتا ہے جتنے لفظوں کی ضرورت ہو۔ ان افسانوں میں موضوع اور اسلوب کی رنگارنگی ہے۔

یہ افسانے قارئین کو پسند آئیں گے یا نہیں، کہا نہیں جا سکتا۔ میں قارئیں کی قیمتی رائے کا منتظر ہوں۔

میں ان سبھی دوستوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ جنھوں نے یہ افسانے پڑھے ہیں اور اپنی رائے سے نوازا ہے۔ میں جناب عبدالمغنی کا شکر گذار ہوں جنھوں نے اِن افسانوں کا ترجمہ ہندی سے اردو میں ِکیا ہے۔

اومکار کول

خبر

اُسے پڑوس میں سب کی پوری پوری خبر رہتی تھی۔ کون کیا کر رہا ہے؟ کس کے گھر کیا پک رہا ہے؟ کون کس کے گھر آتا جاتا ہے؟ کس کے بچّے کیا کرتے ہیں؟ اس چھوٹے سے محلے میں کیا کچھ ہو رہا ہے؟ اس کی پوری تفصیل آپ کو مسز شرما سے ہی ملتی۔ اس کا رعب ایسا تھا کہ سبھی محلے والے ان سے ڈرتے تھے۔ گھریلو معاموں میں سبھی اس سے صلاح مشورہ بھی کرتے تھے، عورتیں اور مرد دونوں۔ بچّے اس بات سے ڈرتے تھے کہ ذرا سی بھی کوئی بات ہوئی تو ان کی شکایت ہوگی، گھر پر مار پیٹ ہوگی۔ وہ چھوٹے بڑے سب کی شرما آنٹی تھی۔

اور تو اور شرما جی بھی اس سے ڈرتے تھے۔ اس کے دفتر سے آنے کا وقت مقرر تھا۔ وہ پانچ دس منٹ بھی دیر سے نہیں آسکتا تھا۔ وہ حیران رہتا تھا کہ ان کے دفتر کی باتیں بھی وہ اکثر ان سے پہلے جان لیتی۔ کئی دلی باتیں بھی اسے معلوم ہوتی تھیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ شرما جی کو اِسے سبھی واقعات سنانے پڑتے تھے آج دفتر میں کیا ڈاک آئی ہے؟ کون کون آئے تھے اور کون نہیں۔ بڑے افسر نے کس کس کو اپنے دفتر میں بلایا، کس سے کیا بات ہوئی۔ شریمتی شرما کو یہ جانکاری حاصل کرنا اچھا لگتا تھا۔ شرما جی اپنی بیوی سے کوئی بھی بات چھپا نہیں سکتے تھے۔ اصل میں اس سے کوئی بات چھپ نہیں سکتی تھی۔

شرما جی کبھی کبھی سوچتے کہ اگر اس کے بجائے اس کی بیوی نوکری کرتی تو اسے کتنی کامیابی ملتی۔ خبریں اکٹھا کرنے میں وہ ماہر تھی اور ان کو اچھی طرح پیش بھی کر سکتی تھی۔ صحافت کے میدان میں انھیں کامیابی ملتی۔ خیر، اس کی ایک ہی کمزوری تھی کہ وہ زیادہ پڑھی

لکھی نہیں تھی۔ وہ بار بار کہتی تھی کہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ وہ نویں جماعت میں ہی پڑھتی تھی کہ اس کے ماں باپ نے اس کی شادی کر دی۔ شادی کے بعد جلدی بچے ہوئے۔ ذمہ داریاں بھی بڑھیں تو وہ پڑھائی جاری نہ رکھ سکی۔ مگر ڈگریوں کا کیا؟ وہ اب بھی محلے کی سبھی زیادہ پڑھی لکھی عورتوں سے ہوشیار ہے۔ سبھی اس کا لوہا مانتی ہیں۔

ان کا بڑا بیٹا ہائی اسکول کا امتحان پاس کرنے کے بعد کسی دوسرے شہر میں تھا۔ محلے میں کسی کو پتہ نہیں کہ وہ وہاں کیا کرتا ہے۔ پچھلے دو سالوں میں وہ دو ایک بار ہی گھر آیا۔ اس کی چھوٹی بیٹی رما کالج جاتی تھی۔

آج ایک خاص واقعہ رونما ہوا۔ ویسے ایک آدھ دن سے اس محلے میں کانا پھوسی ہو رہی تھی۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ رما دو دن سے گھر نہیں آئی۔ آج اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر چھپی تھی کہ وہ کسی رمیش کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ ساتھ میں کچھ جمع پونجی بھی لے گئی ہے۔ رمیش رما کو گھر پر پڑھاتا تھا۔ وہ پڑھا لکھا بے روزگار نوجوان تھا۔ پاس ہی کے ایک محلے کا رہنے والا تھا۔ کسی کو بھی اس بات کا یقین نہیں آ رہا تھا۔

شرما جی اپنی بیوی کو بار بار یہی کہہ رہے تھے کہ تمھارے رہتے ہوئے یہ سب کیسے ہوا؟ تمھیں اپنے ہی گھر کا پتہ نہیں رہا؟ شریمتی شرما بالکنی میں کھڑے ہو کر زور زور سے چلانے لگیں، یہ خبر غلط ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔

انٹرویو

ان کی کافی عزت و توقیر تھی۔ بڑے بڑے تعلیمی ادارے انھیں اکثر سلکیشن کمیٹی میں ماہر کی حیثیت سے بلاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اپنے موضوع پر انہیں قدرت حاصل ہے۔ وہ نپے تلے سوال پوچھتے ہیں۔ امیدواروں کی سٹی پٹی گم کر دیتے ہیں۔

اس تعلیمی ادارے میں پہلی بار وہ ماہر کے طور پر آئے۔ پانچ امیدواروں کے انٹرویو ہوئے۔ سب سے سوال پوچھے۔ کسی سے مطمئن نہ ہوئے۔ آخر میں ایک امیدوار آیا۔ اندر آتے ہی اس نے انھیں جھک کر نمستے کی۔ دوسرے ممبروں کی طرف ہاتھ جوڑ کر مُسکرایا۔ کمیٹی کے صدر نے ماہر سے سوال کرنے کے لیے کہا۔ لیکن ان کا سادہ جواب تھا، "اس سے سوال آپ ہی پوچھے۔ یہ میرا شاگرد ہے۔ بھلا اس سے میں کیا پوچھ سکتا ہوں؟" کمیٹی کے دوسرے ممبر بھی بھلا کیا سوال پوچھتے۔ وہ مُسکراتا ہوا سب کو نمستے کرنے کے بعد کمرے سے باہر نکلا۔ انتخاب اسی کا ہوا۔

تعلق

وہ دونون ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے۔ لمبی چھٹی کے بعد سبھاش اپنے شہر سے لوٹا۔ اسے سریتا کی شادی کی اطلاع ملی۔ اس نے سریتا کو ایک گہرے گلابی رنگ کی ساڑی میں دور سے دیکھا۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ اس کا گھر پاس ہی تھا۔ بابو کو اطلاع کر کے وہ لنچ سے پہلے ہی گھر چلا گیا۔

سریتا لنچ کے وقت اس کے گھر آئی۔ مسکراتے ہوئے سبھاش کو نمستے کی۔ چاہنے پر بھی وہ مسکرا نہ سکا۔ وہ اپنے بیڈروم میں بستر پر منہ چھپائے سکنے لگا۔ سریتا پاس آکر پلنگ پر بیٹھی۔ اس کے سر اور کمر کو سہلانے لگی۔ طبیعت کے بارے میں پوچھا۔ سبھاش پلٹا۔ اس کو دیکھ کر وہ کھلے طور پر رونے لگا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔ سریتا نے رومال سے اس کے آنسو پونچھے۔ اس نے سبھاش کو اپنے سینے سے لگایا۔ سبھاش کے آنسوؤں سے سریتا کا بلاؤز بھی گیلا ہونے لگا۔ سریتا کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔

کچھ منٹوں میں ایک دوسرے میں مکمل طور پر کھو گئے۔ جب ہوش آیا تو سریتا کہہ رہی تھی، شادی میں نے سریش سے کی ہے۔ شادی تو کرنی ہی تھی۔ پیار میں صرف تم سے ہی کرتی ہوں۔

سبھاش اپنے کپڑے ٹھیک کرنے لگا۔ سریتا باتھ روم میں چلی گئی۔ سریتا نے کچن میں چائے بنالی۔ دونوں نے ڈرنگ روم میں چائے پی۔ دفتر سے چھٹی ہونے کا وقت ہو گیا تھا۔ وہ اُٹھ کر چلنے لگی۔ جاتے جاتے پوچھا، اب تم ہم دونوں کو کھانے پر کب بلاؤ گے؟ میں نے سریش سے تمھاری تعریف کی ہے۔ وہ تم سے ملنا چاہے گا۔

مُلاقات

آکاش اور اروند کسی ورکشاپ میں ملے تھے۔ دونوں مین جان پہچان ہوئی۔ کچھ دِنوں بعد آکاش کسی کام سے دلّی آیا۔ اروند سے ملنے اس کے دفتر گیا۔ اروند اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس نے چائے منگوائی۔ دونوں اِدھر اُدھر کی گپ شپ کرنے لگے۔

اتنے میں ایک خوب صورت خاتوں کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا ناک نقشہ بہت تنیکھا تھا۔ بال کٹے تھے۔ وہ کچھ جلدی میں تھی۔ وہ سیدھے اروند کی میز کے پاس آئی۔ اروند کو ایک لفافہ دے کر فوراً لوٹی۔ اس کے آنے سے ایک بھینی بھینی سینٹ کی خوشبو کی لہر پھیل گئی تھی۔ آکاش کے منہ سے ایک دم نکلا: " کیا چیز ہے۔ کون ہے یہ؟"

اروند نے فوراً جواب دیا، "یہ میری بیوی ہے۔"

الّو

اکادمی میں ہمالیہ کے فنون، تہذیب اور چیرندوں، پرندوں وغیرہ کی نمائش لگی ہوئی تھی۔ چاروں طرف جوش تھا۔ خاص طور پر ان کے من میں جو اس علاقے سے متعلق رہے ہیں اور اپنے کو ماہر سمجھتے ہیں۔ اسی لیے پردیپ نمائشی چیزوں میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہے تھے۔ پردیپ سے ان چیزوں پر بات چیت ہوئی:

انکُر : آپ نے نمائش میں پہاڑی الو دیکھا؟

پردیپ : جی دیکھا۔

انکُر : الو نے بھی آپ کو دیکھا؟

پردیپ : ہاں، دیکھا۔

انکُر : پہچانا؟

پردیپ نے جواب نہیں دیا۔ انکُر کو اس ماہر کے جواب کا اِنتظار رہا۔

کتاب پر تبصرہ

ان کی کِتاب پر تبصرہ اس لیے اچھا نہیں تھا کیوں کہ تبصرہ نگار ایک اعلا عہدے پر فائز انھیں کے موضوع کے جانے مانے عالم تھے۔ تبصرہ دیکھ کر وہ تلملائے۔ اپنے تین شاگردوں کو چائے پر گھر بلایا۔ کتاب کے تبصرے پر گفتگو ہوئی۔ اپنے شاگردوں کے منہ سے تبصرہ نگار کو دی جانے والی گالیوں سے ان کا غصّہ ٹھنڈا ہوا۔

ان کے من میں خیال آیا۔ تینوں شاگردوں کو انھوں نے کتاب پر تبصرہ لکھنے کو کہا۔ تینوں ایک دوسرے کا منہ تاکنے لگے۔ نہ وہ موضوع جانتے تھے اور نہ ان میں لکھنے کی ہمت تھی۔ وہ جان گیا۔ تینوں کو ایک ایک کر کے کتاب پر تبصرہ کا املا دیا۔ تین رسالوں کے مدیروں کو الگ الگ تبصرے بھیجے گئے۔

تبصرے شائع ہوئے۔ اب کتاب کے بارے مین ایک ہی منفی تبصرہ تھا اور تین تعریفی۔ انھیں کافی اطمینان ہوا۔ شاگردوں کو اس بات سے خوشی تھی کہ ان کے شائع شُدہ مضامین کی فہرست میں اضافہ ہوا۔

ہمت

وہ بچپن سے ہی شرمیلا تھا۔لڑکیوں سے بات کرنے سے کتراتا تھا۔ دل ہی دل میں ضرور چاہتا تھا کہ اس کی بھی کسی لڑکی سے دوستی ہو۔ کئی موقع گنوائے۔ اکثر کسی بھی لڑکی سے بات کرتے وقت اس کی زبان کانپنے لگتی اور دل کی دھڑکن بڑھ جاتی۔

وقت بدل گیا۔ وہ نوکری کرنے لگا۔ دفتر میں بھی وہ سب سے خاص طور سے عورتوں سے کھل کر بات نہیں کر پاتا تھا۔ لوگ اسے اکثر "بدھو" کہتے تھے۔

وہ بدلنا چاہتا تھا، لیکن کیسے؟ وہ اپنے دیگر ہم کاروں کو جن میں عورتیں بھی شامل تھیں، کھلے دل ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھتا تو کبھی کبھی اس کے ہونٹوں پر بھی کپکپاہٹ کے بدلے مسکراہٹ آنے لگتی تھی۔ جسے وہ چھپانے کی کوشش کرتا تھا۔

سشما پر نجانے اسے کیوں بھروسہ تھا؟ وہ اکیلی عورت تھی جو اس کا مذاق نہیں اڑاتی تھی۔ اس سے احترام سے بولتی تھی۔ سشما کا تقرر حال ہی میں اس دفتر میں ہوا تھا۔

ایک دن لنچ کے وقت سشما اس کے کمرے میں آئی۔ آلوک نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ سشما بولی، "چلیے کینٹین میں چائے پیتے ہیں۔"

آلوک ایک دم تیار ہو گیا۔ دونوں کینٹین میں داخل ہوئے۔ کافی بھیڑ تھی۔ ایک ٹیبل خالی ملی۔ سشما کو وہاں بٹھا کر وہ چائے لینے کاؤنٹر پر گیا۔ جب چائے کی دو پیالیاں ٹرے میں رکھ کر لوٹ رہا تھا، اس نے دور سے ہی دیکھا، سشما کے ٹیبل پر اس کا ایک دوسرا ساتھی رمیش بیٹھا تھا۔ دونوں کسی بات پر کھلکھلا کر ہنس رہے تھے۔ آلوک کے پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ اس نے کاؤنٹر کے پاس ہی ایک خالی ٹیبل پر چائے کی ٹرے رکھی اور سب کی نظر بچا کر کینٹین سے باہر نکلا۔ اس کے دل کی دھڑکن اچانک تیز ہو گئی۔

پریتی

کھانا کھا کر میں اندر کے کمرے میں آرام کرنے کے لیے چلا آیا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ ایک تکیہ کے سہارے میں فرش پر لیٹا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ کمرے میں آئی۔ ایک آٹھ نو مہینے کی بچّی کو گود میں لیے۔ ایک ہاتھ میں دودھ کی بوتل تھی۔ میں نے بیٹھنے کی کوشش کی۔ اسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ درمیانہ قد، جاذب چہرہ، ہلکا سا میک اپ اور بالوں کی لٹیں ماتھے پر بکھری ہوئی تھیں۔ بڑی بڑی کجراری آنکھیں۔ اس نے کڑھائی والا ہلکا لال سوٹ پہنا تھا۔ بغیر کچھ بولے وہ کھڑکی کے پاس آئی۔ ایک بیگ سے دودھ کا ڈبا نکالا۔ دودھ کے پاؤڈر کو پانی کی بوتل میں ملایا۔ پھر میرے پاس ہی کونے میں بیٹھی اور بچّی کو بوتل سے دودھ پلاتی رہی۔ اتنے میں چاچی جی اندر آئیں۔ وہ میرے لئے ایک کپ چائے لائی تھیں۔ چائے کی پیالی فرش پر رکھی۔ میں اکیلئے چائے پینے سے ہچکچا رہا تھا۔ میری ہچکچاہٹ سمجھ کر وہ بولی۔ "آپ چائے پی لیجیے"۔ "پر آپ؟" اتنے میں چاچی جی بولیں، "میں پریتی کے لئے بھی لے آؤں گی"۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ایک اور کپ چائے لے آئی اور پریتی کے سامنے رکھی۔ اتنے میں اس کی گود میں بوتل سے دودھ پیتی ہوئی بچّی سو گئی تھی۔ میں نے کہا، "بچّی سو گئی ہے"۔ "ہاں، یہ نیند میں بھی دودھ پیتی ہے۔"

اس نے پاس ہی فرش پر بچّی کو لٹایا۔ تو یہ پریتی ہے۔ پریتی کون؟ میں سوچتا رہا۔ اسے کوئی لڑکی دروازے پر بلانے آئی۔ وہ بچّی کی رضائی ٹھیک کر کے اُٹھی۔ میں نے کہا، " گھبرایئے نہیں۔ میں یہیں پر ہوں"۔

اگر جاگ جائے گی تو پریشان کرے گی۔" وہ بولی۔

" کوئی بات نہیں۔ میں بچّی کو سنبھال سکتا ہوں۔" یہ سن کر وہ ایک دم مسکرائی اور چل دی۔ اس کی آنکھوں میں معصومیت جھلک رہی تھی۔

چار پانچ منٹ بعد وہ پھر دروازے تک آئی اور میری طرف دیکھا۔ میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ بچّی سو رہی ہے۔ وہ پھر مسکراتے ہوئے دروازے سے ہی لوٹی۔

چاچی جی کمرے میں آئیں تو میں نے پوچھا، "یہ پریتی کون ہے؟"

"اوہ، تم جانتے نہیں، میں تعارف کرانا بھول گئی۔ یہ رمیش کی بہو ہے۔"

"رمیش کی؟" میں حیرانی سے بولا۔

"ہاں، کیوں کیا بات ہے؟"

" کچھ نہیں، اچھی ہے۔" میں مسکرایا۔

"ہاں ، بہت ہی اچھی"۔ چاچی جی شرارتی لہجے میں بولیں۔

رمیش ہمارے گاؤں کا ہی ایک پڑوسی لڑکا ہے۔ وہ کسی بینک میں کام کرتا ہے اور آج کل ہریانہ کے کسی شہر میں ہے۔ میں رمیش کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اتنے میں بچّی ایک دم جاگی۔ اس کے رونے سے پہلے ہی میں نے اسے گود میں اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں نے باقی دو تین کمروں میں دیکھا، پریتی وہاں نہیں تھی۔ میں بچّی کو لے کر گھر سے باہر نکلا تو وہ اندر آ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر تھوڑا بہت شرمائی۔ میں نے بچّی کو اسے تھماتے ہوئے کہا، " کتنی پیاری بچّی ہے"۔ پریتی بچّی کو لے کر میرے پیچھے پیچھے اسی کمرے میں آئی اور وہاں دودھ کی بوتل ٹھیک کرنے لگی۔ میں نے پوچھا۔

"رمیش جی کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہی ہوں گے، بہت دنوں سے آئے نہیں۔"

"مطلب؟ مہینے میں کتنی بار آتے ہیں؟"

"مہینے میں؟ دو تین مہینے میں ایک بار آتے ہیں، وہ بھی دو ایک دن کیلئے۔"

"ایسا کیوں؟ آپ لوگ بھی وہیں کیوں نہیں چلے جاتے۔"

"ممی کو وہ جگہ پسند نہیں۔ میری دونوں نندیں اسی شہر میں ہیں۔ میرے جیٹھ اپنی بیوی کے ساتھ چنڈی گڑھ میں ہیں"۔

"پر اپنی ساس کی خاطر آپ......"

"وہ یہاں اکیلے کیسے رہ سکتی ہیں" ہلکے سے مسکراتے ہوئے اس نے کہا۔ رمیش اور پریتی کا بیاہ دو سال پہلے ہوا تھا۔ شادی کا کارڈ میرے پاس بھی آیا تھا۔ رمیش کے والد کی اچانک موت ہو چکی تھی......

میں پریتی کے بارے میں بہت دیر تک سوچتا رہا۔ اس کے لئے کشش ہمدردی میں بدل گئی۔ دوسرے دن بارات روانہ ہوئی۔ میں بس میں بیٹھا۔ بس چلی تو میری سیٹ کے پیچھے سے ہلکی ہنسی سنائی دی۔ پیچھے مُڑا تو دیکھا پریتی کسی اور عورت کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ آج سنہرے رنگ کی ریشمی ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ اس کے چہرے پر ہلکا میک اپ تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے "نمستے" کی۔ اس کا چہرہ خوشی سے بھرا تھا۔

میں نے پوچھا، "شویتا کہاں ہے؟"

"ممی کے پاس ہے"۔

اسے دیکھ کے بالکل محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ وہ خوش نہیں ہے۔ اس کے پاس خوشیوں کا خزانہ تھا جیسے وہ بانٹنا جانتی تھی۔

اتحاد

وہ چار بہنیں تھیں۔ سبھی ایک دوسرے سے تیز مزاج۔ ان کی ماں بھی ایسی ہی تھی۔ شادی کے بعد ان کی ہی چلتی رہی۔ ان کے خاوند پورے حکم کے غلام رہے۔ چاہنے پر بھی وہ "چوں" نہ کر پائے۔ سبھی بہنوں کے بیٹے ہوئے اور بیٹیاں بھی۔ تقدیر کا لکھا یہ کہ بیٹیاں اپنی ماؤں پر گئیں، اور بیٹے اپنے اپنے باپ پر۔

وقت گذرا۔ چاروں کی بہوئیں آئیں۔ بہوؤں کا انتخاب بھی انھوں نے ایسا کیا کہ وہ دبو نہ ہوں۔ کوئی بھی بہو اپنی ساس سے دبی نہیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں بہوئیں اپنی ساسوں سے تنگ آگئیں۔ اب وہ ان کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھیں۔ دو الگ رہنے میں کامیاب رہیں۔

بہوئیں اکثر ایک دوسرے سے ملتی رہیں۔ سبھی پریشان تھیں۔ سب کی ایک ہی جیسی پریشانیاں تھیں۔ وہ ہم خیال نہ ہو پائیں۔ سبھی سمجھوتہ کرنے پر مجبور تھیں۔ وہ ایک دوسرے کی صلاح بھی مان نہیں رہی تھیں کیوں کہ وہ سبھی ایک دوسرے سے اپنے کو عقل مند سمجھنے لگی تھیں۔ ساسیں ان میں یہ جذبہ جگانے میں کامیاب رہیں کہ ان کی بہوئیں آپس میں کوئی صلاح مشورہ نہ کریں اور وہ ایک دوسرے سے دور رہیں۔

بہوئیں مجبور تھیں۔ وہ الگ الگ طریقوں سے لڑتی رہیں۔ ان میں سے ایک بار بار کہہ رہی تھی "کاش، ہم بہوؤں میں اتحاد ہوتا تو ہم نے اپنی ساسوں کو ہردوار پہنچا دیا ہوتا"۔ کسی نے پوچھا، "گنگا جی کے کنارے یا گنگا جی میں؟" وہ بڑے اطمینان سے بولیں، "بس کنارے تک...... وہ بے شرم تھوڑی ہی ہیں کہ......"

پہچان

اُسے ہمیشہ فکر رہتی تھی کہ اس کے اپنے نام کی پہچان برقرار رہے۔ اسے اس بات کا فخر تھا کہ اس کا نام سشما ہے۔ جب وہ بچّی تھی تو اسے کسی کا "منّی" یا "چھٹکی" کہنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ ہمیشہ اس بات پر چڑ جاتی تھی کہ اسے "منّی" یا "چھٹکی" وغیرہ کوئی کیوں کہے جب کہ اس کا ایک خوب صورت نام سشما تھا۔ اس کی ایک پہچان تھی۔

بچپن میں ڈرائنگ میں اس کی خاص دلچسپی تھی۔ اسے جب بھی کچھ وقت ملتا تو لکیریں کھینچتی تھی یا الٹی سیدھی تصویر یا ماڈل بناتی رہتی، اس کے نیچے اپنے پورے دستخط کرنا نہ بھولتی۔ وہ گم نام نہیں رہنا چاہتی تھی۔ اسکول اور کالج میگزینوں میں اس کے نام سے کچھ نظمیں چھپ بھی چکی تھیں۔

اس طرح چاروں طرف سشما کی چھاپ تھی۔ وہ جب بھی خط لکھتی تھی تو کوئی اسکیچ ضرور بناتی تھی۔ ہر خط میں اس کی اپنی نظموں کے نمونے بھی ہوتے تھے۔ اس کے خط بھی الگ قسم کے تھے۔ بچپن سے ہی اس نے اپنا نام کمانے کی ٹھان لی تھی۔ اس نے ایم۔اے تک تعلیم حاصل کی۔ اس کو ٹیچر کی نوکری ملی۔ اس کی خط و کتابت بڑھتی گئی۔ میرے پاس اس کے خط لگاتار آتے رہے۔ اس کے خطوں میں اسکیچ ہوتے تھے اور نظمیں بھی۔ اس کی شادی ہوئی۔ اس نے اپنا نام نہیں بدلا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے نام کی اپنی پہچان ہے۔ وہ اپنے کو مسز یا شریمتی نہیں بتلانا چاہتی تھی۔ وہ سشما تھی اور بس سشما۔ وہ اپنے ساتھیوں سے بھی یہی کہنے لگی۔

کچھ سال گذرے۔ اس کے خط آنے بند ہوئے۔ میں اس بار کسی کام سے اس

کے شہر میں آیا۔ میں اس سے ملنا چاہتا تھا۔ اس کے اسکول میں جاکر پتہ چلا کہ وہ نزدیک ہی کسی محلے میں رہتی ہے۔ وہاں پہنچ کر کئی لوگوں سے اس کے گھر کا پتہ پوچھا لیکن نہیں ملا۔ پھر کسی سے پتا چلا کہ ایک "ماسٹرنی" نزدیک کے مکان میں رہتی ہے۔ میں اس مکان میں پہنچا۔ مکان مالک باہر آیا۔ میں نے پوچھا:

"سشما میڈم یہاں رہتی ہیں کیا؟"

"پپو کی ممی کوئی ملنے آئے ہیں۔" اس نے آواز لگائی:

کچھ ہی لمحوں کے بعد پپو کی ممی یعنی سشما باہر آئی۔ پپو بھی ساتھ تھا۔ اب اس کی اپنی کوئی پہچان نہیں تھی۔

لمس

اس کیمپ میں گھومتے ہوئے ایک ٹینٹ کے سامنے آکر اس کے پاؤں رُک گئے۔ ٹینٹ کے پاس ہی ایک جانی پہچانی صورت نظر آئی۔ وہ پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے مسکراتے ہوئے نمستے کی۔ نمستے کا جواب دے کر بھی وہ ایک دم پہچان نہ پایا۔ وہ اس کی ادھیڑبن سمجھ گئی۔ اس نے کہا:

"نہیں پہنچانا، پہنچانو گے بھی کیسے؟ میں اُما ہوں"

اُما، "اوہ! معاف کرنا...... میں ...... آپ یہاں کیسے؟"

وہ اس کے چہرے میں برسوں پہلے بچھڑا ہوا بھولا سا کم سن چہرہ تلاش کرنے لگا۔ اس کے بائیں گال پر کالا تل برقرار تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں کشش ابھی بھی تھی۔ اس کے بات کرنے کا انداز وہی تھا۔ ہاں، اس کے لمبے لمبے بال جو اس کے ماتھے پر بکھرے رہتے تھے، اب بندھے ہوئے تھے۔ بالوں کا رنگ قدرتی نہیں لگ رہا تھا۔ ان میں ہیئر ڈائی کی چمک تھی۔ ہاں، اس کے متناسب جسم میں اس کے دبلے پتلے نازک جسم کو ڈھونڈنا مشکل تھا۔ کچھ پل وہ انھیں خیالوں میں کھویا تو اُما بولی، "آیئے، اندر آیئے۔ یہی ہمارا گھر ہے۔"

اس نے ٹینٹ کا ادھ کھلا پردہ ہٹایا اور اندر چلی گئی۔ وہاں ایک ڈبل بیڈ پڑا ہوا تھا۔ اور ایک طرف دو لکڑی کی کُرسیاں۔ وہ اندر آیا اور ایک کُرسی پر بیٹھا۔ اُما بیڈ پر بیٹھی۔ اس نے ٹیبل فین چلایا۔ اندر گرمی تھی۔ اٹل کے من میں کئی سوال ابھرے۔ سب سے اہم سوال تھا، "تمھارے گھر میں کون کون ہیں؟"

دو بچے ہیں، ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ لڑکا بارہویں کلاس میں ہے اور لڑکی دسویں کلاس میں۔"

"اور ان کے والد؟"

"وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔"

"اس بات کا مجھے افسوس ہے۔ کیا بات ہوئی؟"

وہ پانچ سال پہلے گزر گئے۔ ان کا ایکسی ڈینٹ ہوا تھا۔"

"سوری، میں نے سنا ہی نہیں۔"

آپ کو کیسے پتا چلتا آپ پردیس میں تھے۔"

"تمھیں...... آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں پردیس میں تھا۔"

مجھے پتہ ہے۔ میں آپ کے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں۔"

"کیا جانتی ہو؟"

"یہی کہ آپ کی شادی ہوئی ہے۔ آپ کے دو بچّے ہیں۔ آپ پردیس چلے گئے۔ واپس آکر اب کسی اونچے عہدے پر ہیں۔ آج کل آپ کوئی فِلم بنانا چاہتے ہیں۔"

"پر تمھیں کیسے معلوم؟"

"اخبار میں چھپا ہے۔ خیر، چھوڑیئے ان باتوں کو۔ میں چائے بناتی ہوں۔"

"میں چائے نہیں پیوں گا۔"

"کیوں نہیں؟ ہم غریب ہیں اس لیے؟"

"نہیں، یہ بات نہیں ہے، میں چائے بہت کم پیتا ہوں۔ خیر، بنالو۔"

اُما اسٹوو جلا کر چائے بنانے لگی۔ اتُل کو بھروسہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بیس سال پہلے کا منظر آیا۔

وہ ایم۔اے کر رہا تھا اور گرمیوں کی چھٹیوں میں گاؤں میں تھا۔ اُما اپنی بڑی بہن

کے یہاں آئی تھی جس کی شادی اُسی گاؤں میں ہوئی تھی۔ وہ بہت نٹ کھٹ تھی۔ اَٹل بہت کوشش کرنے کے باوجود بھی اس سے تعلق نہ بڑھا سکا۔ وہ کئی بار اَٹل کی چھوٹی بہن کے ساتھ اس کے گھر بھی آئی۔ ایک بار سیڑھیوں پر اترتے وقت دونوں ایک دم رُک گئے تھے۔ اَٹل نے بڑی ہمت کر کے اس کی بانہہ پکڑی تھی۔ اُما نے بڑی پھرتی سے اپنی بانہہ چھڑائی اور بڑی تیزی سے سیڑھیاں اُتری۔ اَٹل کو یہ لمس بہت اچھا لگا۔ اٹل اور اُما کو پھر کبھی اکیلے ملنے کا موقع نہ ملا۔ دونوں ایک دوسرے کو دور سے دیکھتے اور مسکراتے رہتے۔ بس صرف اتنی پہچان تھی۔

چھٹیاں ختم ہوئیں۔ اَٹل شہر چلا گیا۔ چھ مہینے بعد گھر آیا تو اسے پتہ چلا کہ اُما کی شادی ہوگئی ہے۔ اَٹل کو اُما کا معصوم چہرہ بار بار یاد آنے لگا۔ وقت گزرا۔ دھیرے دھیرے وہ اُما کو بھول گیا۔ تعلیم ختم ہوئی۔ وہ پردیس گیا۔ لوٹنے پر کسی دوسرے صوبے میں نوکری ملی۔ اس کی شادی ہوئی۔ بچے ہوئے۔

کشمیر میں حالت بگڑ گئے۔ ہزاروں کی تعداد میں کشمیری مہاجر جموّں اور دیگر شہروں میں آگئے۔ اَٹل کے دِل میں مہاجروں پر فِلم بنانے کا خیال آیا۔ جموّں کے ایک مہاجر کیمپ کا دورہ کر رہا تھا شاید فِلم کا مسودہ تیار کرنے کے ارادے سے۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس کی ملاقات اُما سے ہوگی۔

وہ انھیں خیالوں میں ڈوبا تھا کہ اُما نے چائے کا کپ اس کے ہاتھ میں تھمایا۔ چائے کا کپ لیتے ہوئے اَٹل نے اُما کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اُما نے اپنا ہاتھ نہیں چھڑایا۔ اَٹل نے نظر اُٹھائی تو اُما کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

چیتاونی

اس کا تعارف یوں دیا گیا۔ ہر فکر سے آزاد، کھیل کود اور سیر سپاٹوں میں دلچسپی اور کم بولنے والا۔ ہمیشہ سست سا لگتا ہے مگر اسے سست کبھی نہ سمجھے گا۔

تعارف سن کر سبھی مسکرائے۔ ٹریننگ کی کلاسوں میں وہ واقعی کم ہی بولتا۔ چائے کے وقت بھی بھیڑ سے الگ رہتا۔ لوگ پتہ نہیں کیا سمجھتے رہے۔ پھر اجتماعی کام کرنے کی باری آئی۔ ایک نشست کی مشق کا منظر۔ اُسے نشست کے صدر کا رول ملا، مایا کو پرسنیل منیجر کا اور راجی کو پروگرام صلاح کار کا۔ نشست شروع ہوئی۔ مایا نے اپنی سبھی باتیں منوائیں اور اپنے حق میں فیصلہ کرا لیے۔ راجی پتہ نہیں کیوں کُڑھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں غصہ اس بات پر اتر آیا کہ صدر محترم پرسنیل منیجر سے ہی مسئلے پر صلاح مشورہ لیتے رہے۔

اس مشق پر تبصرہ ہوا۔ راجی نے بار بار اسی بات کو دُہرایا۔ کلاس کے باہر بھی وہ اس بارے میں باتیں کرنے لگی۔ اُسے یقین ہوا کہ صدر کا رول ایک سست دکھائی دینے والے شخص نے نہیں کیا تھا بلکہ کسی چالاک شخص نے جس کے بارے میں چیتاونی پہلے سے ہی دی گئی تھی۔

راجی نے اپنے دِل کی بات کسی سے نہ چھپائی۔ مایا سے کہا، "پتہ نہیں تم میں ایسی کون سی خاصیت ہے کہ کمل کے دل کو تم نے ایک دم جیت لیا۔" مایا کو راجی کی باتیں فضول سی لگ رہی تھیں۔ اس نے کبھی اس کی باتوں کا بُرا نہ مانا۔ وہ اور لوگوں کی طرح ہی کمل سے بھی بولتی رہی۔ راجی کے سامنے کچھ زیادہ ہی۔

اس دن وداعی کا ڈنر تھا۔ ڈنر باہر لان میں تھا۔ کئی اور مہمان بھی آئے ہوئے

تھے۔ اندر ایک کمرے میں کاک ٹیل تھا۔ سب کے گلاس بھرے ہوئے تھے۔ کمل یہاں بھی الگ سا دکھائی دے رہا تھا۔ راجی اور مایا اس کے سامنے صوفے پر بیٹھیں۔ اِدھر اُدھر کی بات چیت ہو رہی تھی۔ اگروال انھیں کوئی لطیفہ سُنا رہا تھا۔ سبھی ہنس رہے تھے۔ اب راجی کا غصّہ کم ہوا تھا۔

بہت دیر ہو گئی تھی۔ دوسرے دن سب کو یہاں سے وداع ہونا تھا۔ سبھی ایک دوسرے سے ہاتھ ملا رہے تھے۔

مایا آج سویرے ٹرین سے جا رہی تھی۔ وہ سب سے وداع لے رہی تھی۔ راجی اپنے کمرے میں نہیں تھی۔ مایا نے کمل کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ تھوڑی دیر کے بعد کمل نے دروازہ کھولا۔ مایا کمل کے کمرے میں راجی کو دیکھ کر حیران ہوئی۔ اس نے دونوں سے وداع لی۔ کمل کے چہرے پر سنجیدگی برقرار تھی اور راجی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ۔

آکروش

اس ادارے میں عمر میں سب سے بڑے ہونے کے ناطے وہ احترام سے "دادا" کہلاتے تھے۔ ویسے انھوں نے پانچ سال پہلے ریٹائرمنٹ لے لیا ہے۔ ان کا اس ادارہ میں دوبارہ تقرر ہوا۔ وہ لگ بھگ پینسٹھ سال کے تھے۔ ان کا موضوع تاریخ تھا۔ اس ادارے میں کسی بھی موضوع پر کوئی بھی نشست کیوں نہ ہو، وہ اپنی مہارت کا اظہار کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے اور کسی بھی موضوع پر اپنی صلاح دیتے تھے۔ چاہے کسی بھی موضوع کی پڑھائی کے بارے میں بات چیت ہو۔ قانون، انتظام، نظام حکومت، تاریخ، سماجیات، سیاست، لسانیات، تہذیب وغیرہ۔ کوئی بھی نشست ان کے خیالات کو سنے بغیر پوری نہیں ہوتی تھی۔ یہ دوسری بات تھی کہ ان کے خیالات پر ہمیشہ عمل نہیں ہوتا تھا۔ کسی بھی خاص موقع کا اہتمام ہو تو وہ پیچھے نہیں رہتے تھے۔ ان سے کوئی صلاح لے یا نہ لے، وہ ہمیشہ اپنی صلاح دینے کے لئے تیار رہتے تھے۔

ادارے میں ایک کلچرل پروگرام منعقد ہو رہا تھا۔ اس میں طلبہ ایک خاص رقص پیش کرنا چاہتے تھے۔ لڑکیوں کو رقص ایک ماہر معلمہ سکھا رہی تھیں۔ دادا بغیر بلائے ریہرسل دیکھنے کے لئے ہال میں پہنچے۔ انھوں نے رقص کا ریہرسل دیکھا اور اپنی عادت سے مجبور رقص پر صلاح دینے لگے۔ معلمہ باہر سے آئی تھیں۔ وہ اپنے موضوع کی ماہر تھی۔ ان کو دادا کے صلاح مشورے مضحکہ خیز لگے۔ انھوں نے بڑی نرمی سے کہا، "اگر آپ ہی رقص سکھا سکتے تھے تو مجھے یہاں مدعو کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

دادا کی مہارت کی مخالفت پہلی بار ہوئی تھی۔ ان کا چہرہ غصے سے تلملا اُٹھا۔ وہ ہال

سے باہر نکلے۔ انھوں نے اپنی توہین سمجھی اور معلّمہ کو سبق سکھانے کی ٹھان لی۔

ادارے کے دیگر اعلیٰ افسروں نے ہم دردی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ سب کی رائے تھی کہ معلّمہ کو دادا کی بے عزتی نہیں کرنا چاہیے تھی۔ فیصلہ ہوا کہ اس معلّمہ کو واپس بھیجا جائے۔ دادا پہلے خوشی سے مسکرائے پھر ایک دم انھیں کچھ خیال آیا۔ بولے، "نہیں انھیں رقص سکھانے دیجیے۔ میں جانتا ہوں کہ کیا کرنا چاہیے۔"

کلچرل پروگرام پیش کرنے کا وقت آیا۔ اس کا سب کو بے صبری سے انتظار تھا۔ ہال تماشائیوں سے کھچاکھچ بھرا تھا۔ دادا پہلی صف میں بیٹھے تھے۔ کئی پروگرام ہوئے۔ تماشائی داد دیتے رہے۔ جن میں دادا بھی شامل تھے۔ جب رقص دکھایا جانا تھا۔ علان ہوتے ہی دادا ہال سے ایک دم اُٹھ کر باہر چلے گئے۔ وہ ٹھیک اس وقت ہال میں لوٹے جب رقص ختم ہو چکا تھا اور تالیوں کی گونج رُک گئی تھی۔ دادا مسکراتے ہوئے ہال میں آئے۔ ان کے چہرے پر خود اعتمادی کی چھاپ تھی۔ انھوں نے رقص پر تالی نہیں بجائی تھی۔ انھوں نے اپنا غصّہ ظاہر کیا تھا۔

شک

سُنیل جب اپنے آفس پہنچا تو نِشا کو اپنے کمرے میں دیکھ کر حیران ہوا۔ اس نے سوچا، ضرور کوئی بات ہے۔ وہ آج ان سے بھی پہلے آفس آئی تھی۔ نِشا کی میز پر ڈھیر سارے کاغذ تتر بتر پڑے تھے۔ وہ کچھ لکھ رہی تھی۔ نِشا کو نزدیک سے دیکھ کر اسے یقین ہوا کہ آج کوئی خاص بات ہوئی ہے۔ لگتا تھا کہ نِشا نیند سے اُٹھ کر ہی آفس آئی تھی۔ یا کسی سے لڑ جھگڑ کر۔ اس کے بال بے ترتیب تھے۔ چہرے پر میک اَپ کا نام و نِشان نہ تھا۔ ساڑی بھی معمولی ہی پہنے ہوئے تھی۔

سُنیل کے اندر آتے ہی نِشا کھڑی ہوئی۔ انھیں دھیرے سے نمستے کی۔ نمستے کا جواب دے کر سُنیل نے پوچھا،

"کیا بات ہوئی؟ اتنی جلدی آفس؟"

"بس کچھ کام تھا۔"

نِشا کی آواز بھی آج بھاری سی تھی۔ سُنیل نے بات آگے بڑھانا اچھا نہ سمجھا۔ وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اسے خیال آیا، شاید اپنے خاوند سے کہا سُنی ہوئی ہوگی۔ وہ اس کی نجی بات میں دخل نہیں دینا چاہتا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں نِشا، سُنیل کے کمرے میں آئی اور چپ چاپ سُنیل کے سامنے کی کُرسی پر بیٹھ گئی۔ سُنیل نے پوچھا:

"ہو گیا کام؟"

"جی...... ہو گیا۔ یہ لیجیے۔"

اس نے ایک کاغذ سُنیل کی طرف بڑھایا۔ سُنیل اسے پڑھ کر حیران ہوا۔ نِشا کا استعفیٰ تھا۔

"آخر کیوں؟"

"بس یوں ہی۔"

"کیا مطلب۔ اتنی سنجیدہ بات پر بھلا اتنی جلدی فیصلہ!"

نِشا کچھ نہ بول کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ سُنیل کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

"کیا کوئی اور راستہ نہیں ہے؟"

"جی ہے۔ مگر مشکل۔"

"مشکل کیسا؟"

"آپ کا یہاں سے ٹرانسفر۔"

"میرا ٹرانسفر؟" سُنیل کی سمجھ میں کچھ کچھ آنے لگا۔

سُنیل مُسکرا کر بولا، "اگر تمھیں اسی بات میں خوشی ہوگی تو میں اپنا تبادلہ کروا دوں گا۔ تم استعفیٰ مت دو۔"

سُنیل پوچھنا چاہتا تھا کہ آخر بات یہاں تک کیسے پہنچی۔ پر پوچھ نہ سکا۔ نِشا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔ اس نے کہا۔ رمیش کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اصل میں کُسم اس کے لئے ذمہ دار ہے۔

"تمھاری نند کُسم؟"

"ہاں۔ پچھلے مہینے رمیش کسی سرکاری کام سے دلّی گیا تھا۔ تین دِن کے لیے۔ کُسم کالج جاتی رہی۔ وہ ایک رات گھر نہیں لوٹی۔ میں بہت پریشان ہوئی۔ میں نے اس سے پوچھ تاچھ کی۔ وہ اِدھر اُدھر کے بہانے کر کے ٹالتی رہی۔ میں اس بات سے بہت پریشان ہوئی۔ جب رمیش ٹور سے لوٹا تو میں نے اس سے ذکر کیا۔ رمیش کو بہت غصہ آیا۔ وہ کُسم پر

بُری طرح برسا۔

تب سے کُسُم نے میرے ساتھ بات کرنا بند کر دیا۔ وہ کسی بھی بہانے کی تاک میں تھی۔ اور جب پچھلے ہفتے ایک دِن میں آفس سے دیر سے آپ کے ساتھ گھر لوٹی، تو پتہ نہیں کیا ہوا۔ اس نے رمیش کی عقل ہی پھیر دی۔ رمیش الٹی سیدھی باتیں سناتا رہا۔ میں اتنی تنگ آگئی کہ نوکری چھوڑنے پر مجبور ہوں۔"

سُنیل کے دِل کو دھکا لگا۔ اُس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ نِشا کے لیے اس کے شفقت آمیز تعلق کو شک کی نظر سے بھی دیکھا جائے گا۔ اور وہ بھی اسی کے گھر والوں کے ذریعے۔

سُنیل نے چپ چاپ نِشا کا استعفیٰ پھاڑ ڈالا۔ اس کا تبادلہ اتنی جلدی ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے فی الحال ایک لمبی چھٹی پر جانے کے لیے عرضی دے دی۔

امتحان

وہ خود ان پڑھ ہے۔ اسے اپنے پوتوں اور پوتیوں کی تعلیمی صلاحیتوں پر پورا بھروسہ ہے۔ وہ انھیں ہمیشہ لکھتے پڑھتے دیکھتی ہے۔ ان کے پاس اپنی دادی سے کہانیاں سُننے کی بھی فرصت نہیں ہے۔ جب وہ چھوٹی تھی تب بات دوسری تھی۔ اب زمانہ بدل چکا ہے۔ بہت ہی کم عمر میں ہی بچّوں کو اِسکول بھیجا جاتا ہے۔ انھیں اسکول میں ہی نہیں، گھر پر بھی ہوم ورک کرنا پڑتا ہے۔ ان کو کھیلنے کودنے کے لیے بھی زیادہ وقت نہیں ملتا تھا۔

اسے معلوم ہے کہ پڑھائی کرنے کے باوجود بھی ان بچّوں کے ہمیشہ اچھے نمبر نہیں آتے۔ ان کے ٹیچر بھی شکایت کرتے ہیں۔

اب کی بار بچّوں کا امتحان ہوا۔ نتیجے ٹھیک نہیں آئے۔ وہ غصّے میں تھی۔ بچّوں کے ماں باپ نے پریشانی ظاہر کی۔ اس نے بچّوں کی قابلیت پر پورا بھروسہ کرتے ہوئے کہا:

"اگر امتحان میں صرف وہی گنے چنے سوال پوچھے جائیں جو ان بچّوں کو نہیں آتے تو اس میں بچّوں کا کیا قصور؟ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ وہی سوال امتحان میں آتے ہیں جو بچّوں نے نہیں پڑھے ہوتے۔"

حسن

تخلیق کے موضوع پر تربیتی کلاس میں کسی نے مدرس سے پوچھا:

"حسن کی تعریف بتایئے؟"

مدرس اس کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس کی نظر ایک دم کسی خاص فرد کی طرف گئی۔ نظریں ملتے ہی وہ مسکرائی اور اس نے نظریں جھکا دیں۔ اس تجربہ کو مدرس کے لیے تعریف میں باندھنا مشکل تھا۔

تنہائی

- اسے آج اگر کوئی چیز پسند ہے تو وہ ہے تنہائی۔ اس کے طالب علمی کے زمانے میں ایسا کچھ نہ تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی سہیلیوں سے گھری رہتی تھی۔ وہ ایک مشترک خاندان کی فرد تھی۔ اپنی اعلا تعلیم حاصل کرتے وقت اس کی شادی کے لیے کئی پیغام آئے۔ اس کے ماں باپ جلدی میں فیصلہ نہ کر پائے۔ جنوب کی کسی یونیورسٹی میں لیکچرر کے عہدے پر اس کا تقرر ہوا۔ اسے امید تھی کہ دو تین سال وہاں رہ کر اسے پھر شمال کی کسی یونیورسٹی میں نوکری مل جائے گی۔ کوشش کرتی رہی پر نہ مل سکی۔ پھر دھیرے دھیرے شمال سے جنوب کی جغرافیائی دوری اس کو شمال سے الگ کرتی رہی۔ شادی کی بات اگر کہیں ہوتی تھی تو اس کی نوکری بیچ میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہوتی۔ اس طرح ایک ایک سال گزرتا رہا۔ اور عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ شای کرنے کی امید بھی ختم ہوئی۔

ایک بار وہ ریل میں سفر کر رہی تھی۔ کسی ہم عمر شخص سے اس کی ملاقات ہوئی۔ وہ کسی اور صوبے اور ذات کا تھا۔ تھوڑے ہی تعارف کے بعد اس شخص نے اس سے شادی کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ شادی ہوئی۔

کسی وجہ سے شادی کا یہ بندھن بہت ہی جلد ٹوٹ گیا۔ اسے لگا کہ اپنے خاوند کو سمجھنے میں اس نے بھول کی ہے۔ اسے اس بات کا بھی احساس ہوا کہ وہ اپنی اکیلی زندگی میں اتنی گھل مل گئی ہے۔ کہ اس میں وہ کسی اور کے ساتھ رہ نہیں سکتی۔

اسے تنہائی سے لگاؤ ہے۔ تنہائی میں سڑک کا شور، گلی بازاروں میں شور شرابے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہاں، اتنے بڑے مکان میں کسی اور شخص کو زیادہ دیر وہ

برداشت نہیں کر سکتی۔ اسے تنہائی سے اتنا لگاؤ ہو گیا ہے کہ اپنے گھر میں وہ کسی اور شخص کی پاؤں کی چاپ بھی نہیں سن سکتی۔

جب بھی کسی کے یہاں مہمان بن کر جانا پڑتا ہے تو وہ وہاں خوش نہیں رہتی۔ خاندان کے اور افراد کے ساتھ بھی گھل مل جانا، اس کے لیے مشکل ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے گھر لوٹنے کے لیے بے چین ہو اٹھتی ہے۔ اپنا سُونا گھر جہاں کسی دوسرے کا احساس نہیں ہوتا۔ اسے اپنی تنہائی سے اتنا پیار ہے، وہ اس کے بغیر رہ نہیں سکتی۔

•

خط

"اپنا پتہ ڈائری میں لکھو" میں نے ڈائری سامنے کرتے ہوئے کہا۔

" کیا فائدہ؟ نہ میں خط لکھوں گی اور نہ آپ سے خط کی اُمید ہی رکھوں گی۔" وہ بے ساختہ بولی۔

"خوب! میں بھی خط کم لکھتا ہوں۔"

اس نے ڈائری میں اپنا نام اور پتہ لکھا۔ ڈائری لوٹائی۔

اس کے جانے کے ایک ہفتہ کے بعد اس کا ٹیلیفون آیا۔ مجھے حیرانی نہیں ہوئی،

"میں ٹیلیفون کرنا نہیں چاہتی تھی، خیر...... کیا حال ہے؟"

دو تین دِن بعد نئے سال کے موقع پر ایک کارڈ آیا اور اس کے ساتھ ہندی میں لکھا بغیر کسی القاب کا خط۔

میں نے جواب نہیں لکھا۔ کئی بار دِل میں آیا، لکھ دوں گا، لیکن لکھوں گا کیا؟ لکھنے کو کیا ہے؟ رسمی باتیں! حال چال! اس کے لیے میں مجبوری میں ہی خط لکھتا ہوں...... اپنے والد صاحب کو کبھی کبھار۔ اور کسے؟ شاید ہی اور کسی کو لکھا ہو۔

جب بھی میں اس کے بارے میں سوچتا ہوں، عجیب سا لگتا ہے۔ اس کے بارے میں میرا امپریشن کیا تھا اور کیا نکلا۔ میں اپنی عادت سے مجبور ہو کر اس سے مذاق کرتا رہا لیکن وہ سمجھ نہ پائی۔ اس نے اس کا مطلب ہی دوسرا نکالا۔ اگر وہ مجھے ڈنر کے لیے دعوت نہ دیتی تو شاید ہی مجھے پتہ چلتا کہ اس کے دِل میں غلط فہمی بھی ہے۔

اس نے کہا، " تاریخ دہرائی جاتی ہے۔ آپ کیوں ایسا کر رہے ہیں؟ اس سے کیا

ملے گا"۔ "تاریخ دہرانا۔ میں سمجھا نہیں۔ کون سی تاریخ اور کس کی تاریخ؟"

میری ادھیڑ بن کو اس نے سلجھانے کے لیے پوچھا، "آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

میں اور حیران ہوا۔ میرے دِل میں یہ کبھی آیا نہیں تھا کہ میں اس سے کچھ چاہتا بھی ہوں۔

وہ پھر بولی، "آپ نے مجھ میں کیا دیکھا؟" میں اور بھی حیران ہوا۔ میں کیسے کہوں کہ میں نے تمھارے بارے میں کبھی سوچا تک نہیں۔ جہاں تک پسند کی بات ہے، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ پر میں نے موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ بالکل الگ قسم کی ہیں۔ مجھے عام طرح کے شخص پسند نہیں آتے۔ آپ میں ضرور ایسی کوئی بات ہے جو آسانی سے کسی کو بھی اپنی طرف کھینچ سکتی ہے......" میں یہ کہتے ہوئے سوچنے لگا، کہیں میں نے زیادہ تو نہیں کہا۔ وہ بولی "پر آپ چاہتے کیا ہیں؟"

اس سوال سے میں اور الجھ گیا۔ کیسے اس سے کہوں، کہ مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے۔

میں تھوڑی دیر چپ رہا۔ وہ بولی:

آپ کو مانگنا بھی نہیں آتا۔ "ڈُو یُو وانٹ ٹُو کِس می، ہولڈی یا اور کچھ......"

میں اس طرح کے سمجھاؤ سننے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ میں نے ہمت بٹور کر کہا:

"مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے۔ کوئی چیز پسند کرنا یا نہ کرنا میرا اپنا مسئلہ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے کیا چاہیے۔ آپ اطمینان رکھیے۔"

میرے الفاظ سن کر وہ حیرانی سے میری طرف دیکھتی رہی۔ اس نے کہا: "یو ڈیزرو مور دین واٹ یو ہیو۔"

دس بج چکے تھے۔ ہم ڈنر لے کر گیسٹ ہاؤس لوٹے۔ اتنے دِنوں کے بعد کبھی کبھار اس کی یاد آتی ہے۔ سوچتا ہوں خط لکھوں۔ کیا لکھوں گا؟ یہ سمجھ میں نہیں آتا۔

سوچ

دوپہر کا کھانا کھا کر اس نے برتن دھوئے۔ وہاں سے ایک اجنبی گھڑ سوار آیا۔ وہ اس کے گانو کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے سوچا کیوں نہ میں اپنے خالی برتن اسی کے ساتھ گھر بھیج دوں۔ مجھے بعد میں اٹھانے نہ پڑیں گے۔ اس نے گھڑ سوار سے درخواست کی۔ "آپ میرے گانو سے گزر رہے ہیں۔ آپ میرے یہ برتن لے کر میرے گھر چھوڑ دیجیے۔"

گھڑ سوال نے منع کرتے ہوئے کہا، "میں جلدی میں ہوں۔ تمہارا گھر ڈھونڈنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔"

کچھ دور آگے چل کر گھڑ سوار نے سوچا، "میں نے غلطی کی۔ مجھے مفت میں ہی کچھ اچھے برتن مل رہے تھے۔ میں انھیں اپنے گھر تو لے جا سکتا تھا۔ نہ میں اسے جانتا ہوں اور نہ یہ مجھے۔ یہ سوچ کر وہ لوٹا اور اس نے کسان کے پاس جا کر کہا، "میں نے سوچا کہ تمھارے گانو جا ہی رہا ہوں۔ میں تمھارے برتن بھی لے جاؤں گا۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ دے دو برتن۔"

کسان نے اس کی بات سُنی اور مُسکراتے ہوئے کہا:

"جو تُم نے سوچا وہ میں نے بھی سوچا۔ میں اب برتن نہیں دے سکتا۔"

منافع

وہ کام کی تلاش میں نکلا۔ اسے ایک گھوڑا ملا۔ گھوڑا لے کر اپنے گانو لوٹا۔ گھوڑا دیکھ کر اس کی بیوی حیران ہوئی۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ اب وہ گھوڑوں کا بیوپار کرے گا۔ گھوڑے خریدے گا اور بیچے گا۔ اس بیوپار میں کافی منافع ہوتا ہے۔

دوسرے دن وہ سویرے گھوڑے کو بیچنے چلا۔ کچھ دور جا کر اسے ایک شخص ملا۔ اس نے گھوڑے کی تعریف کر کے پوچھا:

"اسے بیچنا چاہتے ہو؟"

"ہاں، اسی لئے میں گھر سے چلا ہوں۔ میں گھوڑوں کا بیوپاری ہوں۔"

"میں اسے خریدنا چاہتا ہوں۔ پہلے میں اس کی سواری کروں گا۔ پھر قیمت طے کریں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" بڑی آسانی سے خریدار کے ملنے پر وہ خوش ہوا۔

خریدار نے اپنی کانگڑی اور کھڑاؤں اس کے پاس رکھی اور گھوڑے پر سوار ہوا۔ اس نے جیوں ہی چابک مارا، گھوڑا سرپٹ دوڑا، اور کچھ ہی دیر میں وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ دیر تک بیوپاری نے اس کا انتظار کیا، پر خریدار نہیں لوٹا۔ شام کو ناامید ہو کر بیوپاری گھر لوٹا۔ بیوی نے پوچھا:

" گھوڑا بیچا؟ کتنا منافع ہوا؟ اس نے بے فکری سے کہا۔

" گھوڑا اُتنے کا ہی بکا جتنے کا ملا تھا۔ ہاں، منافع میں کانگڑی اور کھڑاؤں ملے۔"

حق

کوشلیا نوے سال کی ہے۔ وہ مکان کے بیچ والے کمرے میں کھاٹ پر لیٹی رہتی ہے۔ یہاں سے گھر میں سبھی آنے جانے والوں پر اس کی نظر رہتی ہے۔ اس کے آس پاس کوئی نہ کوئی ضرور بیٹھا رہتا ہے۔ اس سے بات کرنے یا اس کی بات سننے کے لیے۔ وہ چل پھر نہیں سکتی مگر اپنے گھر اور پاس پڑوس کے سبھی واقعات سے وہ اچھی طرح واقف ہے۔ اتنا ہی نہیں اس گھر میں اس کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہر چھوٹی بڑی بات میں اس سے مشورہ لینا ضروری ہے۔ روز کھانے میں کیا بنے گا سے لے کر گھر کے سبھی رشتہ داروں میں کس کا رشتہ کہاں ہوگا۔ یہ سبھی باتیں۔ اس سے پوچھ کر ہوتی ہیں۔

کوشلیا اپنی بیوہ بیٹی شانتا کے گھر لگ بھگ پچھلے چالیس سال سے رہتی آئی ہے۔ کوشلیا کی دو اور بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ شانتا جوانی میں ہی بیوہ ہوئی۔ اس کے دو چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ شانتا کو اپنے خاوند کے دفتر میں نوکری ملی۔ اس کے بچوں کی دیکھ بھال کرنے کے لئے کوشلیا اس کے گھر میں رہی۔ کوشلیا نے گھر کا سارا کام سنبھالا۔ اس نے بچوں کی پرورش میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ گھر کے کام میں بیٹی کا ہاتھ بٹاتی رہی۔ اگر وہ ہمت نہ کرتی تو اس کی بیٹی نہ نوکری ہی کر پاتی اور نہ اس کا گزارا ہی چلتا۔

اس طرح اس گھر اور خاندان کے تمام چھوٹے بڑے فیصلے وہی کرتی رہی ہے۔ اپنے کو وہ اس گھر کا خصوصی فرد مانتی رہی۔ وہ مانتی ہے کہ گھربار اسی کا ہے اور اس کی مرضی کے بغیر یہاں پتا بھی ہل نہیں سکتا۔

اس گھر میں وقت کے ساتھ ساتھ کافی وسعت ہوئی۔ بچے بڑے ہوئے۔ ان کی

شادیاں ہوئیں۔ ان کے بھی آگے بچے ہوئے۔ خاندان میں وسعت کے ساتھ ساتھ کوشلیا کے فرائض اور حقوق اور بھی بڑھ گئے۔ وہ اب کچھ سالوں سے بیمار چل رہی ہے۔ گھر والے طرح طرح کا علاج کراتے رہے۔ اس کا آپریشن بھی ہوا۔ آپریشن کے بعد پتہ نہیں کیوں وہ اپنی بیماری کا قصوروار شانتا اور گھر کے دیگر افراد کو مانتی ہے۔ وہ علاج سے مطمئن نہیں ہے۔ اس کے اس رویہ سے سبھی پریشان ہیں۔ اس کی بیٹی شانتا کو سانس لینے کی فرصت نہیں ہے۔ وہ گھر گرہستی کے کام میں مصروف رہتی ہے۔ اس نے اپنی ماں کے علاج کرانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ بہت پیسے خرچ کیے۔ اس پر اپنی ماں کی کھری کھوٹی برابر سننی پڑتی ہے۔ وہ اکثر کہتی ہے، "آپریشن کیوں کرایا؟ علاج ٹھیک نہیں ہو رہا ہے۔ مجھے مار ڈالنا چاہتی ہو۔" کوشلیا سے جو کوئی بھی ملنے آتا ہے وہ شانتا اور گھر کے دیگر افراد کی شکایت کرتی ہے۔ سبھی جانتے ہیں کہ یہ کوشلیا کی زیادتی ہے مگر اس سے کہے کون؟ وہ دِلاسہ دیتے ہیں۔" سبھی تمھاری دِل و جان سے خدمت کر رہے ہیں۔"

اگر کوئی ایسا کہے بھی تو اس کا جواب ہوتا ہے، "میں مالکن ہوں۔ گھر بار میرا ہے۔ تُم چاہتے ہو کہ میں مر جاؤں اور میرا حق کوئی اور چھین لے۔

اتنی سی بات

ٹرین چلی۔ ہم دونوں آمنے سامنے والی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھتی ہوئی گم سم سی تھی اور میں بھی اپنے ہی خیالوں میں ڈوبا ہوا۔ ٹرین اگلا اسٹیشن آنے سے پہلے ہی رُکی۔ میں بیٹھے بیٹھے تنگ آ گیا تھا۔ وہ بھی کبھی میری طرف دیکھتی تھی اور کبھی باہر کی طرف۔

"آپ کہاں جا رہی ہیں؟ میں نے یونہی پوچھ لیا۔

"دلّی۔ اور آپ؟"

"میں بھی دِلّی جا رہا ہوں۔ کیا آپ پڑھتی ہیں؟"

"نہیں، نوکری کرتی ہوں۔" وہ بولی۔

"نوکری؟ ابھی آپ کی عمر...... "میرے منھ سے نِکلا۔ وہ بیس بائیس سال کی لگ رہی تھی۔ اکہرا بدن، گورا رنگ، آنکھوں پر چشمہ اور تھوڑے ابھرے ہوئے دانت۔ اس نے پرنٹ والا ہلکا ہرا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ وہ مُسکراتے ہوئے بولی:

"میں پچھلے چھ مہینے سے ہی نوکری کر رہی ہوں۔ میں نے پچھلے سال انگریزی سے ایم۔اے۔ کیا۔ بس نوکری لگ گئی۔ سر، آپ کیا کرتے ہیں؟"

"میں پروفیسر ہوں۔" میں نے جواب دِیا۔

" کہاں؟" اس نے پوچھا۔ میں نے پرس سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر اسے پکڑایا۔

"میں بھی پی۔ایچ۔ڈی کرنا چاہتی تھی۔ لیکن نوکری ملنے پر پڑھائی چھوٹ گئی۔"

اِدھر اُدھر کی بات کرتے ہوئے میں نے کاؤنسلنگ کے میدان میں اپنی دِلچسپی کا ذِکر کیا۔ اس نے پوچھا، "کیا آپ اسٹرولوجی پر یقین کرتے ہیں؟"

میں نے کہا، "نہیں۔ اس میدان میں میری دِلچسپی نہیں ہے۔ ہاں، بچپن میں ہاتھ دیکھنے کا شوق تھا۔ اور اب چہرہ پڑھنے کا۔"

"میرا چہرہ دیکھ کر میرے بارے میں بتا سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں۔ آپ فطرتاً بڑی سیدھی سادی ہیں۔ کسی کا بھی یقین آسانی سے جیت سکتی ہیں۔ ہاں، کبھی کبھی فیصلے جلد بازی میں کرتی ہیں۔"

میں پتہ نہیں کیا کیا بولتا رہا۔ وہ دھیان دے کر سُن رہی تھی۔ اس وقت ایک اسٹیشن پر گاڑی رُک گئی۔ وہ بولی، "اسٹیشن سے چلنے پر میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔" کافی والا اندر آیا۔ ہم نے کافی پی۔ ٹرین چلی۔ سامنے سے اُٹھ کر وہ میری بغل میں بیٹھ گئی۔ میں اس کی بات سُننے کے لیے بے قرار تھا۔ وہ سنجیدہ ہو کر بولی:

"میں ایک گہرے مسئلہ میں اُلجھی ہوں۔ آپ میری مدد کریں گے؟"

"دیکھیے، مجھے پتہ نہیں کہ میں کیا مدد کر سکتا ہو۔ ہاں، اپنے مسئلہ کے بارے میں کسی دوسرے سے بات چیت کرنا ٹھیک رہتا ہے۔ کبھی کبھی اس سے مسئلہ سلجھانے میں مدد ملتی ہے۔"

"مسئلہ اس طرح ہے۔ میں جس آفس میں کام کرتی ہوں، وہاں میرا تعارف راکیش نام کے ایک لڑکے سے ہوا۔ وہ راجستھان کا ہے۔ شروع شروع میں وہ بہت شرمیلا تھا۔ وہ بہت کم بات کرتا تھا۔ دھیرے دھیرے ہمارا تعلق بڑھا۔ میں آفس میں نئی نئی آئی تھی۔ اس نے کام سمجھانے کا ذمہ اپنے اوپر لے لیا۔ پہلے کچھ دنوں صرف کام کے بارے میں تھوڑی بہت بات ہوتی رہی۔ بعد میں کام کی باتیں کم اور اِدھر اُدھر کی باتیں زیادہ ہوتی رہیں۔ پہلے وہ روز میرے کمرے میں آ کر میرے پاس آدھا گھنٹہ بیٹھتا، بعد میں اس کا

میرے کمرے میں آنا جانا بڑھتا گیا۔ ہم دونوں کا میل جول آفس میں اب عام چرچا کا موضوع بننے لگا۔ اس نے مجھے اپنے گھر کے بارے میں بتایا اور میں نے اسے اپنے بارے میں ۔ ہم ایک دوسرے کو دِل سے چاہنے لگے۔

ایک دِن میں نے اس سے کہا "میرے گھر والے میری شادی جلدی کرنا چاہتے ہیں۔ تمھارا کیا ارادہ ہے؟" وہ بولا، "اچھی بات ہے۔ والدین سے میرے بارے میں کہو۔ میرے ماں باپ ایک دم مان جائیں گے۔"

"میں اپنے ماں باپ سے کیسے بات کروں گی۔ تُم ہی کرلو۔" میں نے کہا۔

"اچھا میں تمھارتے گھر آجاؤں گا۔" وہ بولا۔

کچھ دِن گزر گئے۔ میری ماں نے ایک دِن کہا، "ہماری ذات برادری کا ایک لڑکا ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ ایک پرائیوٹ کمپنی میں اچھی نوکری کرتا ہے۔ وہ تمھیں کل دیکھنے آئے گا۔" ماں کی بات سُن کر میں ایک دم چونک گئی۔ میں نے کہا، "پر، ممی، میرے آفس میں ایک لڑکا ہے۔ وہ میرے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ ہم ایک دوسرے کو چاہتے ہیں......"

میری ماں بولی، "دیکھو سیما تُم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ یہ لڑکا کل آئے گا۔ دیکھ لینا۔ اگر تمھیں پسند نہ ہو تو زبردستی تھوڑے ہی ہاں کہنی ہے۔ تمھارے ماما جی نے لڑکے کو دیکھا ہے۔ بڑی تعریف کر رہے تھے۔ تمھارے آفس والے لڑکے کو ہم نے دیکھا نہیں ہے۔ پتہ نہیں وہ کیسا ہے۔ اس کے گھر والے کیسے ہیں۔ پھر یہ صرف تمھاری مرضی پر منحصر ہے۔"

خیر، میں لڑکا دیکھنے کے لیے تیار ہوئی۔

دوسرے دِن راجیش گھر آیا۔ کافی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ دیکھنے میں اچھا لگا۔ ہنس مُکھ ہونے کے علاوہ اس کے بات کرنے کا ڈھنگ دِلکش تھا۔ اس نے مجھے پسند کیا۔

میری ماں بولی، "راجیس کو تُم پسند ہو۔ اب تمھیں اپنی رائے دینی ہے۔" دو تین

دِن میں بات ٹالتی رہی۔ میں راکیش سے بات کرنا چاہتی تھی۔ وہ چھٹی پر تھا۔ جب وہ آفس آیا، میں نے راجیش کے بارے میں بات کی۔ اس کے چہرے کا رنگ ایک دم بدل گیا۔ اس نے کہا، "میں گھر گیا تھا اور میں نے تمھارے بارے میں اپنے ماں باپ سے بات کی ہے۔ وہ شادی کے لیے تیار ہیں اور تُم......"

اِدھر گھر پر میرے سبھی رشتہ دار راجیش کو پسند کر چکے تھے۔ وہ بار بار اس کی تعریف کرتے رہے۔ اس کی نوکری اچھی ہے۔ تنخواہ اچھی ہے۔ وہ ترقی کرے گا۔ وہ خوش مزاج ہے...... وغیرہ وغیرہ۔ میں تذبذب میں رہی۔ دِل میں خیال آتے رہے، اس میں شک نہیں کہ راجیش بُرا نہیں...... نوکری اچھی ہے، مزاج اچھا ہے، ہنس مُکھ ہے، ملنسار ہے۔ پر راکیش......

ظاہراً میرے ماں باپ اور دیگر قریبی رشتہ داروں کا دباؤ میرے اوپر بڑھتا رہا۔ اس درمیان راجیش نے دو تین بار ٹیلیفون پر مجھ سے بات کی۔ بار بار پوچھتے رہے، "میں آپ کا فیصلہ جاننا چاہتا ہوں۔" میں کئی دِن تک آنا کانی کرتی رہی۔ پھر ایک دِن میں نے راکیش سے کہہ دیا، "راکیش، میں مجبور ہوں۔ میرے گھر والے مجھ پر دباؤ ڈال رہے ہیں۔ وہ راجیش کو پسند کرتے ہیں۔" راکیش سمجھ گیا اور وہ چپ چاپ میرے کمرے سے باہر چلا گیا۔ دوسرے روز اس نے پندرہ دِن کی چھٹی کی درخواست بھیجی۔

میں نے راجیش سے شادی کرنے کی ہاں کر دی۔ پرسوں ہماری سگائی ہوئی۔ شادی کی تاریخ مُقرر ہوئی۔ چار مہینے کے بعد شادی ہو گی۔ میں دِلّی لوٹ رہی ہوں۔ میری گھبراہٹ بڑھ گئی ہے۔ مجھے یہ پتہ نہیں کہ میرا فیصلہ صحیح ہے کہ غلط۔

جب بھی میں اپنے منگیتر راجیش کے بارے میں سوچتی ہوں تو فوراً راکیش کی صورت میرے ذہن میں آتی ہے۔ میں راکیش کو ایک پل بھول نہیں سکتی۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ راکیش کو دیکھتے ہی میں رو پڑوں گی۔ مجھے اپنے اوپر قابو نہیں رہے گا۔ راجیش

کو میں کچھ ہی دِنوں سے جانتی ہوں۔ پر راکیش کو پچھلے چھ مہینوں سے۔ اسے میں بہت کوشش کرنے کے بعد بھی بھول نہیں سکتی۔

کل ہی میں نے اپنی بچپن کی سہیلی کو اپنا سارا دُکھ سُنایا۔ اس کی صلاح تھی کہ مجھے راکیش کو ایک دم بھول جانا چاہیے اور راجیش کے بارے میں ہی سوچنا چاہیے۔ وہ بار بار کہتی رہی، "تُمھارا راکیش سے تعلق ہی کیا رہا ہے۔ آفس میں تھوڑا بہت میل جول۔ اتنی سے بات کے لئے تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری سہیلی کے لئے بس یہ اتنی سی بات ہے، پر میرے لئے......"

سیما یہ سب کہہ رہی تھی۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

سانپ

وہ ایک دوسرے کو تھوڑے دِنوں سے جانتے تھے۔ رما کسی ریسرچ کے سلسلے میں رمیش کے اِدارے میں آئی تھی۔ پہلے پہل ریسرچ کے بارے میں بات چیت ہوتی رہی بعد میں باقی باتیں بھی۔ دونوں میں جتنا تعلق بڑھا، اتنی ہی ایک دوسرے کے ساتھ نوک جھونک بھی ہوتی رہی۔

کسی بھی بات میں دونوں ایک دوسرے سے باتوں میں ہارنا نہیں چاہتے تھے۔ آج رمیش نے رما کو اپنے گھر ڈنر پر دعوت دی تھی۔ ڈنر کے بعد دونوں سیر کر رہے تھے۔ ادھر ادھر کی باتیں چل رہی تھیں۔ رما کو ایک دم کچھ یاد آیا۔ اس نے کسی سے سُنا تھا کہ رمیش کے گھر کے لان میں ایک سانپ نکلا تھا۔ وہ بولی،

"، لوگ تو آستین میں سانپ پالتے ہیں۔ سُنا ہے کہ آپ اپنے لان میں بھی پالتے ہیں۔"

"ٹھیک سُنا ہے۔ اپنے گھر پالتا ہی نہیں، کھانا کھلا کر ساتھ ساتھ سیر بھی کراتا ہوں۔"

صلاح

اسے مینا کے بالوں پر لگا بڑا کلپ اچھا نہیں لگتا تھا۔ ایک بار بڑی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے مینا سے کہا،

"آپ اپنے خوب صورت بالوں پر یہ کلپ کیوں لگاتی ہیں؟ یہ کھلے اچھے لگیں گے۔"

"دیکھئے مسٹر، یہ میرا نجی معاملہ ہے۔ میں نے کسی کی صلاح نہیں مانگی۔"

وہ ایک دم چپ رہا۔ کرتا کیا؟ دوسرے دِن مینا کے بالوں میں کلپ نہیں تھا۔

سُکھ

مجھے آگرا جانا تھا اور اسے غازی آباد۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ بس سٹینڈ کے لئے چلے۔ میں نے اسکوٹر لے لیا اور ہم دونوں اس میں بیٹھ گئے۔ بس سٹینڈ پہنچ کر ہم دونوں پہلے اس جگہ پر گئے جہاں سے غازی آباد کے لیے بسیں جاتی تھیں۔ میں فوراً کاؤنٹر پر گیا اور اس کے لیے بس کا ٹکٹ خرید کر لے آیا۔ اسے بس میں بٹھایا اور ٹکٹ دے دیا۔ کچھ دیر وہ چپ رہی۔ پھر ایک دم بولی:

"میں دِلّی سے غازی آباد بہت جاتی ہوں...... ہمیشہ بس سے ہی۔ پہلی بار کسی نے مجھے بس میں بٹھایا ہے اور ٹکٹ خرید کر دیا ہے۔ پہلی بار آپ نے احساس دِلایا کہ دوسرے کا سہارا لینے میں کتنا سُکھ ہے۔"

بس کے چلنے کا وقت ہُوا۔ میں بس سے اُتر کر کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

مطلب

اس کو دیکھتے ہی وہ خوشی سے کھل اُٹھی۔ دروازے تک آکر "جیجا جی، جیجا جی" کہتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔ اسے حیرانی ہوئی۔ وہ اسے دو مہینے پہلے پہلی بار ملا تھا۔ وہ اس کی بیوی کی ایک نئی شاگردہ تھی۔ جس کو وہ "جیجی، جیجی" نام سے پُکارنے لگی تھی۔

اس کا رنگ روپ، ہنس مُکھ چہرہ، بڑی بڑی نشیلی آنکھیں آسانی سے کسی کو اپنی طرف کھینچ سکتی تھیں۔

وہ ہنستے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ اس نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"سالی بن گئی ہو۔ یہ رشتہ بڑا نازک ہے۔ اس کا مطلب جانتی ہو؟"

"کیوں نہیں؟"

"کیا مطلب ہے؟"

"ہاتھ واتھ پکڑ سکتے ہیں اور کیا؟"

رشتہ

اِدارے کے قریب ہی ایک چھوٹا سا مہمان خانہ تھا دو کمروں کا۔کھانے پینے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ شام کو میں باہر سے ہی کھانا کھا کر آیا تھا۔ چودھری جی نے کہا کہ سویرے وہ چائے بھیج دیں گے اور ناشتہ بھی ان کے ساتھ ہی ہو گا۔

چودھری جی کا گھر بالکل ہی قریب تھا۔ سویرے سات بجے میں خود ہی چودھری جی کے گھر گیا۔ گھنٹی بجائی۔ کسی لڑکی نے پردہ ہٹا کر کھڑکی سے دیکھا پھر جھٹ سے مُسکراتے ہوئے دروازہ کھولا۔ بیٹھنے کے کیئے اِشارہ کیا۔ میں صوفے پر بیٹھا۔ وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی اور چودھری جی کو بھیجا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ چائے کی ٹرے لے آئی۔ ایک پیالی میری طرف بڑھائی اور دوسری چودھری جی کی طرف۔ اس کی عمر کوئی اٹھارہ بیس سال کی رہی ہو گی۔ گول گول چہرہ اور ناک نقشہ تیکھا تھا۔ چہرے پر معصومیت ہونے کے باوجود اُس کی آنکھوں میں شرارت کی ہلکی لہر سی موجود تھی۔ اُس کے بارے میں جاننے کی خواہش پیدا ہوئی۔ کون ہے یہ؟ میں نے پہلے چودھری جی کے گھر اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

دوسرے دِن جب میں کھانے کی میز پر بیٹھا تو وہ کھانا لے آئی۔ آج میں نے چودھری جی سے دھیرے سے پوچھا، "یہ کون ہے؟ آپ نے اس کا تعارف نہیں کرایا۔"

وہ دھیرے سے بولے، "اس کا کوئی نہیں ہے۔ ہمارے گھر دو سال سے ہے۔ یہی گھر کا سارا کام کاج کرتی ہے۔"

وہ جب دوبارہ سبزی لے کر آئی، اب کی بار اس کا چہرہ زیادا پُر کشش لگا۔ میں اسے غور سے دیکھنا چاہتا تھا پر وہ ٹیبل پر سبزی کا ڈونگا رکھ کر فوراً کچن میں چلی گئی۔ چودھری

جی بولے:

"کنچن بڑی سیدھی سادی لڑکی ہے۔ گانو میں اسکول گئی ہے۔ میری بیوی اپنے میکے گئی تھی۔ وہاں اس سے مُلاقات ہوئی۔ وہیں سے اسے اپنے ساتھ یہاں لے آئی۔ اس نے یہاں کا سارا کام کاج سیکھ لیا ہے۔ کھانا بناتی ہے، کپڑے دھوتی ہے اور بچّوں کا خیال رکھتی ہے۔ ہم دونوں اسے بہت چاہتے ہیں۔"

دوسرے دِن سویرے میرے کمرے میں دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میری نیند کھُل گئی اور میں نے آنکھیں ملتے ملتے دروازہ کھولا۔ حیرانی ہوئی۔ کنچن چائے کی ٹرے لے کر سامنے کھڑی تھی۔ میں نے کہا، "ارے، آپ یہاں کیوں آئیں؟ میں خود آجاتا۔" وہ مُسکراتے ہوئے بولی، "بابو جی نے کہا......" اس نے ٹرے ٹیبل پر رکھی اور فلاسک کھولنے لگی۔ میں ٹوتھ برش کرنے باتھ روم میں گیا۔ جب واپس آیا تو دیکھا کہ اس نے میرا بستر ٹھیک کیا تھا۔ اس نے کمبل لپیٹ کر رکھا تھا اور چادر بچھائی تھی۔ اس نے فوراً فلاسک سے کپ میں چائے انڈیلی اور چائے کی پیالی میری طرف بڑھائی۔ اس نے پوچھا،

"بابو جی پوچھتے ہیں کوئی کام......؟"

"نہیں تو...... ہاں کچھ کپڑے پریس کرانے ہیں......مگر......"

"دے دیجیے۔ میں کر کے لاتی ہوں۔ بابو جی کے بھی کرنے ہیں۔"

میں نے سوٹ کیس سے دو قمیض اور پینٹ نکال کر دیں۔ وہ کپڑے لے کر چپ چاپ چلی گئی۔

شام کو جب میں جانے کی تیاری کر رہا تھا، وہ کپڑے لے کر کمرے میں آئی۔ کپڑے ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولی،

"اچھا صاحب، آپ جا رہے ہیں؟"

ہاں، شام کی فلائٹ ہے۔"

"دوبارہ کب آئیں گے؟"

"پتہ نہیں۔ کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"بابو جی مجھے گانو بھیج رہے ہیں۔"

"کیوں؟ یہاں تم خوش نہیں ہو کیا؟"

"خوش ہوں۔ کہتے ہیں کہ میرے ماما جی نے بُلایا ہے۔"

"تیرے ماما جی؟ ان کو کیا پڑی؟"

"کوئی بات ہے......"۔ اس کے چہرے پر پریشانی جھلک رہی تھی۔

"کیا آپ بابو جی کو سمجھالیں گے تاکہ گانو نہ بھیجیں۔ میں یہی رہنا چاہتی ہوں۔" میں نے دیکھا اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے ایک دم چلی گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد چودھری جی مجھے ہوائی اڈا چھوڑنے آئے۔ میں نے کنچن کے بارے میں بات کی اور پوچھا،

"کیوں اسے گانو بھیج رہے ہیں جب وہ جانا نہیں چاہتی؟"

"اس کے ماما نے اس کا رشتہ پکا کیا ہے۔"

"آپ کہتے تھے اس کا کوئی نہیں ہے۔"

ایک دور کا ماما ہے۔ وہ کل آیا۔ ہم خود اس کو نہیں بھیجنا چاہتے تھے۔ ہم اس کی شادی بھی وقت پر کرانے کی سوچ رہے تھے لیکن وہ مانا نہیں۔ ہم رشتے کے بیچ میں کیا بول سکتے ہیں؟ آخر وہ اس کا ماما ہے، دور کا ہی سہی۔ ہمارے ساتھ اس کا کیا رشتہ ہے؟"

ہمدردی

مذہبی اور سماجی کاموں میں مصروف رہنے کے سبب، پڑھنے لکھنے کے لئے ان کے پاس وقت نہیں ہے۔ ان کے کمرے میں دو تین شیشے کی الماریوں میں کتابیں بھی ضرور ہیں۔ ان کی میز کے ایک کونے میں ان کی پی۔ ایچ۔ڈی کا غیر شائع شدہ مقالہ ہمیشہ پڑا رہتا ہے۔ کبھی کبھی اس کے صفحے بھی پلٹتے رہتے ہیں۔ مقالہ لکھنے کے علاوہ شاید ہی کوئی اور ریسرچ کی ہو۔

پروفیسر ہونے کے باوجود انھیں پڑھانے کے لئے نہ تیاری کرنے کا وقت ملتا ہے نہ شاید اسے وہ ضروری ہی سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی مشکل ہے تو بس اتنی کہ طلبا ان کے پڑھانے سے بالکل مطمئن نہیں ہیں۔ برسوں سے وہ اپنے کانفیڈنشل فیڈ بیک فارموں میں یہ لکھتے آئے ہیں" انھیں کیوں پڑھانے کے لیے رکھا گیا ہے؟ انھیں نوکری سے نکالا جانا چاہیے، وغیرہ"۔ خیر، سرکاری نوکری پکی ہے۔ کسی کو نوکری سے کیسے نکالا جا سکتا ہے۔

آج شام کو بہت ضروری کام سے مجھے ان کے گھر جانا پڑا۔ دروازے کی گھنٹی بجائی۔ اندر سے ڈھولک بجنے اور گانے کی آواز آ رہی تھی۔ دروازہ کافی دیر کس نے نہیں کھولا۔ میں نے ہلکہ دھکا دیکر دروازہ کھولا۔ دیکھا، پروفیسر صاحب کچھابنیان پہنے زور زور سے ڈھولک پیٹ رہے تھے اور ان کی بیوی ہارمونیم بجا رہی تھیں۔ میاں بیوی کیرتن میں مست تھے۔ آنکھ کے اشارے سے مجھے بیٹھنے کو کہا۔

انھیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے ان پر ترس آیا۔ میرے دِل میں طلبا کے لئے ہمدردی پیدا ہوئی۔

وقت

اسے دیکھتے ہی کسی فلمی گیت کا مصرع " کبھی نظر-ملائے کبھی نظر چرائے" یاد آتا ہے۔ بات کرتے ہوئے وہ پُرکشش انداز میں نظریں ملاتی ہے اور چراتی ہے۔

آج وہ گیسٹ ہاؤس میں میرے کمرے کے سامنے سے گُزری۔ میں نے اسے اندر آنے کے لئے کہا۔ وہ اندر آئی اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ رہنے والی دِلّی کی ہے۔ حال ہی میں اس کا تقرر اس ادارے میں کسی پروگرام میں ہوا ہے۔ میں نے چائے منگائی۔ وہ چائے بنانے لگی۔ میں نے یونہی پوچھا،

"یہاں کیسا لگتا ہے؟"

"ٹھیک ہے پر کبھی کبھی بوریت بھی ہوتی ہے۔" وہ بولی۔

" کیوں، ایسی کیا بات ہے؟"

وہ نظریں اٹھا کر بولی، "یہاں سب اپنے اپنے کام میں اتنے مصروف ہیں کہ کسی کوکسی کے لئے وقت ہی نہیں۔"

"وقت؟ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ اتنی خوب صورت لڑکیوں کو بھی کسی کے وقت کا محتاج رہنا پڑتا ہے۔" میں نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ وہ فوراً بولی،

"یہاں بھی بات چیت میں وقت ہی گزرتا جا رہا ہے۔ کیا فائدہ؟"

میری سمجھ میں اس کی دلیل نہیں آئی۔

زبان

نِشا سے میری مُلاقات اسی گیسٹ ہاؤس میں پچھلے مہینے ہوئی تھی۔ وہ ہندوستانی الاصل کی امریکی شہری ہے۔ حال ہی میں تین مہینے کے لئے رِیسرچ کرنے کے سلسلے میں ہندوستان آئی ہے۔ وہ ہندی سیکھنا چاہتی تھی۔ میں نے اپنے ایک مقامی دوست سے تعارف کرایا۔ اس نے ہندی سیکھنا شروع کیا۔

اب کی بار ملی تو وہ ہندی میں بات کرنے لگی، "میرا نام نِشا ہے۔ میں ہندی سیکھ رہی ہوں......" وہ بولتی رہی۔ مجھے اچھا لگا۔ میں نے کہا،

"بہت اچھا۔ تم تو ہندی بہت اچھی سیکھ گئی ہو۔ تمھارا ہندوستان میں کیا پروگرام ہے؟"

"ہندی میں بتا نہیں سکتی" وہ فوراً بولی۔ دراصل وہ کئی جملے رٹ چکی تھی...... پر اپنے پروگرام کے بارے میں نہ بول پائی۔ انگریزی میں بولی۔ میں نے اسے کچھ دِن کے لئے میسور آنے کی دعوت دی۔ وہ بولی،

"کیا وہاں بھی ہندی میں بولنا ہوگا؟"

"ضروری نہیں۔ وہاں کنڈا سے کام چلے گا۔" میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ پھر میں کنڈا سیکھنا شروع کروں گی۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔

رعایت

کسی ٹریننگ کورس میں حصہ لینے کے لئے وہ سڈنی میں تھا۔ ایک شام کو وہ کنگس کراس کے فیشن ایبل شاپنگ سینٹر میں گھوم رہا تھا۔ چاروں طرف خوب رونق تھی۔ ایک خوب صورت ماڈ دوشیزہ نے نزدیک آکر کہا:

"ہیلو ڈارلنگ!"

"ہیلو!" اس نے آگے بڑھ کر دوشیزہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر پوچھا،

"کتنے پیسے؟"

"بیس ڈالر" دوشیزہ نے جواب دیا۔

"طالب علم کے لیے کوئی رعایت ہے؟" اس نے پوچھا۔

موت

شام کو میں یونیورسٹی کیمپس میں گھوم رہا تھا۔ ایک دم لینا سے سامنا ہو گیا۔ ہم دونوں فرنچ کلاس میں ساتھ تھے۔ اس کے میک اپ اور فارمل پوشاک کو دیکھ کر میں نے مُسکراتے ہوئے پوچھا:

"آج کس کی موت آئی ہے؟"

"مرنا چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"میری ایسی قسمت ہی کہاں ہے کہ تمھارے ہاتھوں......" میں ایک لمبی سانس کھینچ کر جواب دیا۔

اس پر ایک ہوائی بوسہ دے کر وہ آگے بڑھ گئی۔

گرو دیو

"میں گرو دیو بول رہا ہوں۔"

" کون گرو دیو؟"

"میرا اصلی نام سریش مشر ہے۔ میں آپ کے خاوند سے بنگلور میں ملا ہوں۔ انھوں نے ہی دِلّی میں ملنے کو کہا ہے۔"

شریمتی شرما سمجھ گئیں۔وہ لنچ پر آنے کے لئے مان گئے۔شریمتی شرما نے کھانا بنانے کی تیاری کی۔تھوڑی دیر بعد، سفید دھوتی اور لمبا کُرتا پہن کر وہ دروازے پر کھڑے تھے۔شریمتی شرما نے احترام سے بٹھایا۔شرما جی کو انھوں نے آفس میں ٹیلیفون کیا تھا لیکن وہ ابھی تک گھر نہیں پہنچے تھے۔گرو دیو بولے،

"مجھے آپ کے پتی دیو نے کہا ہے کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ اس لئے میں آیا ہوں۔آپ اپنی بیماری کے بارے میں بتائیے۔

" شریمتی شرما انھیں چائے دے کر سامنے بیٹھیں اور اپنی بیماری کے بارے میں بولیں۔ وہ ایک کاغذ پر کچھ لکھتے رہے۔ بیچ بیچ میں کچھ منتر گنگناتے رہے۔

اتنے میں شرما جی آئے۔گرو دیو ان سے بولے،

"میں نے سبھی باتیں نوٹ کر لی ہیں۔ میں انھیں بالکل ٹھیک کر سکتا ہوں۔ ہاں، باقاعدہ طور پر گرو دیو ماننا پڑے گا۔ مجھ سے دیکشا لینی ہو گی۔ کئی ایم۔پی، ایم۔ایل۔اے اور منسٹر مجھے اپنا گرو دیو مانتے ہیں۔ میں نے بہت بھکتوں کا کلیان کیا ہے۔"

اتنے میں کھانا کھانے کا وقت ہوا۔شریمتی شرما نے کھانا ٹیبل پر لگایا۔شرما جی نے

ابھی اُن دیوتا کو پرنام نہیں کیا تھا، گرو دیو کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ وہ کہنے لگے،

"میں سترہ دِن سے اپواس (روزہ) کر رہا ہوں۔ میں براہمنوں کے علاوہ کسی کے ہاتھ کا بنا کھانا نہیں کھاتا۔"

"کیا آپ کے چیلے بھی براہمن ہیں؟"

"نہیں تو، میرے چیلے سبھی دھرموں اور جاتیوں کے ہیں، ہاں، دیگر مذہبوں اور ذاتوں کے چیلوں کو میں دور سے ہی آشیرواد دیتا ہوں۔"

"میں آپ کی باقاعدہ طور پر دعوت کا انتظار کروں گا۔" یہ کہہ کر گرو دیو روزانہ ہو گئے۔

شردھانجلی

کارڈ پڑھ کر مجھے افسوس ہوا۔ اکٹر گریوال نہیں رہے۔ ان کی آتما کی شانتی کے لیے شوک سبھا (ماتمی جلسہ) رکھی گئی تھی۔ جس میں کیرتن اور پاٹھ کے علاوہ شردھانجلی پیش کرنے کے بھاشن بھی ہونے تھے۔

یہ شوک سبھا اسی ادارے کی طرف سے منعقد ہو رہی تھی جس کے ساتھ ڈاکٹر گریوال کئی سال وابستہ رہے تھے۔ مذہب اور ادب میں ریسرچ کے بارے میں اپنے وقت کے ایک ممتاز ادیب اور مذہب کے عالم و فاضل نے یہ ادارہ شروع کیا تھا۔ ڈاکٹر گریوال نے یونیورسٹی میں آنے سے پہلے اسی ادارے میں کچھ سال کام کیا تھا۔ جب یونیورسٹی سے ریٹائر ہوئے تو دوبارہ اسی ادارے میں کام کرنے لگے۔

ڈاکٹر گریوال کی تقرری جب یونیورسٹی میں مذہب اور ادب سے متعلق شعبہ میں ہوئی تو طرح طرح کی باتیں ہوئی۔ شاید اس لئے کہ وہ اپنے لباس، رہن سہن کے ڈھنگ اور برتاؤ سے بالکل الگ تھے۔ بدن پر سفید کھادی کا کُرتا پاجامہ، سر پر سفید پگڑی، پانْو میں چپل پہنتے تھے۔ سردیوں میں ایک کھادی کی واسکٹ پہنتے اور لوئی نما شال لپٹتے رہتے تھے۔ ان کا بات کرنے کا لہجہ الگ تھا۔ وہ زور زور سے ہنستے تھے۔ بات کرتے ہوئے اکثر دوسرے کی بانہہ پکڑتے۔تھے یا پیٹھ چھوتے تھے۔ گھر پر سیدھے سادے ڈھنگ سے رہتے تھے۔

باتیں وہ کسی بھی موضوع پر کر سکتے تھے۔ مذہب اور ادب سے لے کر آج کے فیشن تک۔ وہ یونیورسٹی کیمپس میں رہتے تھے اور اصرار کر کے لوگوں کو اپنے گھر بلاتے تھے۔

وہ دو کمروں کے فلیٹ میں اکیلے رہتے تھے۔ گھر میں دو تین کُرسیاں تھیں اور کھانا بنانے کے لئے کسی لڑکی کو رکھا تھا جو صبح اور شام کام کرتی تھی۔ جب کوئی مہمان آتا تو اس کے لیے چائے ناشتہ بناتی تھی۔

جتنا ڈاکٹر گریوال کے دوستوں کا دائرہ دن بہ دن بڑھتا رہا اُتنا ہی ان کے دشمنوں کا بھی۔ ان کے دوستوں کے حلقے میں شامل ہوئے دو ایسے ممتاز پروفیسر۔ جو اپنے موضوعات میں جتنے ماہر تھے اُتنے ہی سنکی بھی۔ ان کی اور کسی سے نہیں بنتی تھی۔ لوگ حیران تھے کہ وہ دونوں ڈاکٹر گریوال کے قریب کیسے آئے؟

ڈاکٹر گریوال میں ایسا کیا تھا کہ وہ جلدی دوست بھی بناتے تھے اور دوستوں کے ساتھ ساتھ دشمن بھی۔ یہ راز کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ایک بات ضرور تھی کہ وہ علماء کا احترام کرتے تھے اور ان کی کھلے دِل سے تعریف کرتے تھے۔

یونیورسٹی میں رہتے ہوئے وہ اپنے ریسرچ پروگرام پر کام کرتے رہے۔ ان کی کئی کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ ان کے تحریری کام سے کچھ لوگ غیر مطمئن تھے اور کئی سخت نقاد۔

میرے ساتھ ان کا زیادہ اٹھنا بیٹھنا نہ تھا۔ ہاں، جب بھی ملتے تو بڑے پیار سے۔ ان کے نجی خاندان کے بارے میں بس اتنا معلوم تھا کہ ان کا ایک بیٹا بیرون ملک تھا اور ان کی بیوی گانو میں رہتی تھی۔ ایک بارہ وہ بیمار پڑے، اسپتال میں انھیں داخل کرانا پڑا تو ان کی بیوی ہی اسپتال میں ان کے ساتھ رہی۔ ٹھیک ہونے پر وہ پھر سے اکیلے رہنے لگے۔

اس شوک سبھا میں کافی لوگ اکٹھا ہوئے تھے۔ ڈاکٹر گریوال کا ایک بڑا فوٹو سامنے ٹیبل پر تھا۔ اس پر پھولوں کی مالا رکھی گئی تھی۔ کیرتن اور پاٹھ ہوا۔ ان کے ساتھیوں نے بھاشن دیئے۔ ان کی بہت تعریف ہوئی۔ کسی نے انھیں 'سنت' کا خطاب دیا، کسی نے 'سادھو' کا، کسی نے انھیں مذہب اور ادب کا اعلیٰ پایہ عالم کہا تو کسی نے انھیں انسانیت کا فرشتہ کہا۔ انھیں جذباتی انداز میں شردھا نجلی پیش کی گئی۔ شردھا نجلی پیش کرنے میں ان کے

وہ ہم کار بھی شامل تھے جو جیتے جی ان کی ہمیشہ تنقید ہی کرتے تھے۔

میں سوچ رہا تھا اگر ایسی تعریف وہ کہیں آج سنتے تو کھلکھلا کر ہنستے۔ شوک سبھا ارداس کے ساتھ ہی ختم ہوئی۔ لوگ اٹھ کر شامیانے سے باہر چلنے لگے۔ جانے سے پہلے وہ ڈاکٹر گریوال کے فوٹو کی طرف ہاتھ جوڑتے۔ میں نے بھی اوروں کی طرح ہاتھ جوڑے۔

ڈاکٹر گریوال کا لڑکا بھی بیرونِ ملک سے آیا تھا۔ وہ سر پر سفید رومال باندھے دروازے پر ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ میں نے بھی ہاتھ جوڑے۔ میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ سفید کرتا پاجامہ پہنے تھا۔ اس کی شکل صورت بہت کچھ اپنے والد سے ملتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک کُرسی پر اس کی ماں دُبکی سی بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ دوپٹے سے آدھا ڈھکا تھا۔ وہ ہاتھ جوڑے بُت جیسی بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ کسی کو پہچان نہیں رہی تھی۔

واپسی

سارے گانو میں بات پھیل گئی کہ رحمان پنجاب سے واپس آ گیا ہے۔ ایک دم عزیز میر کے آنگن میں چھوٹے بڑے سبھی اکٹھا ہوئے۔ بچوں نے شور مچایا۔ رحمان کی ماں ساجا بچوں میں شیرینی، چھوہرے اور بادام بانٹ رہی تھی۔ بڑے گرم گرم قہوہ پی رہے تھے۔ رحمان ایک ایک کر کے سب سے گلے مل رہا تھا یا ہاتھ ملا رہا تھا۔ گانو کے بڑے بوڑھے اسے دعائیں دے رہے تھے اور اس سے پنجاب کے بارے میں سوال پوچھ رہے تھے۔ وہ ان سبھی سوالوں کا مختصر جواب دے رہا تھا۔ اس کے ماں باپ بہت خوش تھے۔ رحمان پورے دو سال بعد پنجاب سے گھر لوٹا تھا۔ وہ بھی بہت سارے پیغام، خط اور تار بھیجنے کے بعد۔

رحمان کو سارا ماحول عجب سا لگ رہا تھا۔ جب وہ گھر سے بھاگ گیا تھا، اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ تب تک گھر نہیں لوٹے گا جب تک وہ نسیم کے ساتھ شادی کرنے کے لایق نہ بنے۔ گلزار اپنی بیٹی کی شادی رحمان سے نہیں کرنا چاہتا تھا جب تک کہ وہ کوئی اچھی سی نوکری کر لیتا۔ جب کشمیر میں بہت دِنوں تک اسے نوکری نہیں ملی تو وہ پنجاب گیا۔ پہلے پہل اس نے کافی مشکلات کا سامنا کیا بعد میں اسے ایک کارخانے میں اچھی نوکری مل گئی۔

رحمان کے والد عزیز میر نے رحمان کو گھر واپس آنے کے لئے کئی پیغام بھیجے اور خط لکھے پر کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے وہ ٹالتا رہا۔ اب رحمان کے والد نے اسے مجبور ہو کر ایک تار بھیجا جس میں لکھا تھا کہ اس کی ماں سخت بیمار ہے۔ رحمان تار ملتے ہی گھر واپس آ گیا۔

گھر پہنچتے ہی اسے پتہ چلا کہ اصل میں اس کی ماں بیمار نہیں تھی۔ یہ صرف چال تھی اسے واپس بلانے کی۔ رحمان بہت ہی مایوس ہوا۔ آخر ایسا جھوٹ بولنے کی کیا مجبوری

تھی۔

شام ہوئی۔ گانو کے سارے رشتہ دار اور پڑوسی اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ رحمان اسی وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ماں سے نسیم کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا مگر وہ ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ ماں باپ نے بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔

رحمان اپنے والد کے ساتھ کھانا کھانے لگا۔ ماں اس کے سامنے بیٹھ کر اسے پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی اور بات بات پر اپنے کو نچھاور کر رہی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد ماں اسے اپنے کمرے میں لے گئی۔ کمرے کا دروازہ کھول کر وہ حیران ہوا۔ سامنے نسیم تھی۔ اسے دیکھ کر وہ پسینہ پسینہ ہوا۔ وہ حیران ہوا نسیم وہاں چپ چاپ بیٹھی تھی۔ نسیم ایک دم رو پڑی۔ رحمان کی ماں نے نسیم کو اپنی چھاتی سے لگا کر اسے چپ کرایا۔ ماں بولی، "بیٹے، یہ تمھاری امانت ہے ہمارے پاس۔ اس کے والد نے اسے ہمارے حوالہ کیا ہے۔"

رحمان اور بھی حیران ہوا۔ اسے یہ سارا خواب سا لگا۔ رحمان کی ماں بولی، " گلزار صاحب پچھلے ہفتہ جنت سدھار گئے۔ ان کی آخری خواہش تھی کہ نسیم کا ہاتھ تمھارے ہاتھ میں دینے کی۔ اسی لئے ہمیں جھوٹا تار بھیجنا پڑا۔ مگر افسوس کہ تمھارے یہاں پہنچے سے پہلے ہی وہ چل بسے۔ مرنے سے پہلے انھوں نے نسیم کو ہمیں سونپ دیا۔"

نسیم دھیرے دھیرے رو رہی تھی۔ رحمان کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھر گئیں۔ وہ ماں کے پاس فرش پر بیٹھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نسیم کو کیسے چپ کرائے۔

دھکا

گریش کچھ ہم سفروں سے بول رہا تھا بغیر کسی ہچکچاہٹ کے۔ باتیں وہی۔ وہ کیا کرتا ہے، کب سے وہ پورٹ بلیئر میں ہے اور اسے کیا کیا پسند ہے۔ نیوی کی نوکری میں اس کا رابطہ مختلف صوبوں کے لوگوں سے ہوا ہے، اس لئے وہ کئی زبانوں میں گا بھی سکتا ہے۔ اسے ستار بجانا آتا ہے۔ اس درمیان اس کے ساتھ والی کُرسی پر بیٹھی اس کی نئی نویلی دلہن شویتا بور ہو رہی تھی۔ وہ بار بار گریش کا دھیان اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بیچ بیچ میں وہ اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ دیتی تھی لیکن گریش پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اپنی ہی دھن میں کہے جا رہا تھا کہ جب بھی اسے فرصت ملتی ہے تو وہ گانا گاتا ہے۔ شادی ہو جانے کے فوراً بعد پچھلے چھ مہینے میں اس کو تین جگہ جانا پڑا۔ کلکتہ، مدراس اور اب پورٹ بلیئر۔ شویتا کے لئے گریش کی یہ بے اعتنائی مجھ سے دیکھی نہ گئی۔ میں نے بیچ میں ہی پوچھا،

"کیا آپ کی بیوی بھی گانا جانتی ہیں؟" شویتا یہ سن کر کچھ چونکی۔ گریش بولا، "اسے گانے کا شوق ہے۔ یہ باتھ روم سنگر ہے۔ ہاں، گھر پر میرے گانے بجانے میں دلچسپی لیتی ہے۔"

یہ سُنتے ہی شویتا کے چہرے کا رنگ پھر سے بدلا۔ بور ہو کر وہ گریش کا ہاتھ دبانے لگی۔ گریش اپنی ہی باتوں میں مست تھا۔

جالی بوائے دیپ پر بوٹ رُکی۔ ہم تینوں کچھ لوگوں کے ساتھ چھوٹی بوٹ سے کنارے تک جا رہے تھے۔ چھوٹی بوٹ کے بیچ میں بچھے شیشے سے سمندر کے پانی کے نیچے چمکتے خوب صورت کورَیل اور رنگ برنگی مچھلیوں کے تیرنے کا منظر بہت خوش گوار تھا۔

شویتا بے صبر بچے کی طرح اس منظر کی طرف ایک دم متوجہ ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک تھی۔ سمندر کے نیچے ایک بہت ہی پُرکشش رنگین نظارہ بکھرا پڑا تھا۔ گریش بھی پہلی بار کچھ منٹ چپ رہا۔ ساحل کے پاس ہی پیڑوں کے جھرمٹ میں بنے پکنک اسپاٹ پر ہم نے اپنا قبضہ جمایا۔ شویتا اور گریش الگ کسی کونے میں چلے گئے۔ کھانا کھانے کے بعد جب میں سمندر میں نہانے کے لیے اترا، گریش اور شویتا کنارے کے پاس نظر آئے۔ گریش پانی میں ڈبکیاں لگا رہا تھا اور شویتا کنارے کے ساتھ ساتھ پانی میں چل رہی تھی۔ اس کی قمیض شلوار بھیگ گئی تھیں۔ وہ ایک شیشے کا جار ہاتھ میں لیے تھی۔ جس میں کوریل کے ٹکڑے اور سیپ وغیرہ جمع کر رہی تھی۔ گریش نے مجھے آواز دی، "ذرا یہ دیکھیے، مجھے کیا ملا؟"

اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی اسٹار فش تھی۔ میں نے کہا، "زندہ ہے۔ اسے جار میں ڈالیے۔" جار کا منھ چھوٹا تھا۔ شویتا بھاگ کر کھلے ڈھکن والا ایک ڈبا لے آئی۔ اسٹار فش کو اس میں ڈالا۔ کچھ کوریل کے ٹکڑے اور سیپیاں ہم پانی سے اکٹھا کرتے رہے اور شویتا انھیں جار میں ڈالتی رہی۔

واپس آکر وہ دونوں بوٹ میں میرے پاس بیٹھے۔ گریش قریب بیٹھی کسی آسٹریلین خاتون ٹورسٹ سے بات کرنے لگا۔ میں نے شویتا سے مُسکراتے ہوئے کہا، "تمھیں اپنے خاوند کا خاص خیال رکھنا پڑے گا۔ یہ دوست بنانے میں ماہر ہیں۔"

"ہاں اس کی یہی عادت ہے۔ بہت بولتا ہے۔ مگر فکر کی بات نہیں۔ کہاں جا سکتا ہے۔" اس بیچ گرایش بولا،

"دیکھیے کتنا بھروسہ ہے اسے مجھ پر۔ لو میرج جو کی ہے۔"

"لو میرج کیسے؟ آپ دونوں کہاں ملے؟" میں نے پوچھا۔

"ہم دونوں ایک ہی دفتر میں تھے۔ ٹریننگ کے بعد میری پوسٹنگ بمبئی میں ہوئی۔

شویتا میرے باس کی اسٹینو تھی۔ ایک بار لفٹ میں چڑھتے وقت اسے میرا ہلکا سا دھکا لگا۔ وہ ناراض ہوئی۔ اس نے میرے باس سے شکایت کی۔ میرے باس نے کہا، " گریش جان بوجھ کر ایسا نہیں کر سکتا۔" وہ مانی نہیں۔ میرے باس نے مجھ سے ذکر کیا۔ میں جھینپ گیا۔ سوچا، چلو معافی مانگ لیتے ہیں۔ شویتا کو جب میں نے دوسرے دن دیکھا، میں نے کہا، "معاف کرنا، تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔" وہ کچھ بولی نہیں۔ کئی دنوں تک ہم دونوں میں کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ ایک دن اس کی بڑی بہن اور شویتا مجھے بازار میں ملے۔ میں ان کی نظر بچا کر نکلنے لگا تو شویتا نے مجھے آواز دی اور اپنی بڑی بہن سے میرا تعارف کرایا۔ اس کے بعد ہم روز ملتے رہے اور ساتھ ساتھ گھومنے پھرنے لگے۔ ایک سال میں ہماری شادی بھی ہو گئی۔" گریش نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا یہ بتانا، کیا تُم نے جان بوجھ کر دھکا دیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، دھکا دیا تھا ضرور۔ مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ بات بگڑ جائے گی۔"

"بات بگڑی کہاں؟" شویتا بیچ میں ہی بولی، "بات تب بگڑے گی جو اب دھکا دو گے۔" ہم تینوں ہنسے۔

بوٹ واپس کنارے پہنچی۔ چھ بج گئے تھے۔ اندھیرا چھا گیا تھا۔ میں نے دونوں سے وداع لی۔ دونوں نے مجھ سے ملنے سرکٹ ہاؤس آنے کی بات کہی۔

کمی

وہ میرین ڈرائیو پر شام کی سیر کر کے چرچ گیٹ کی طرف مُڑ گیا۔ اپنے ہی کچھ خیالوں میں کھویا ہوا۔ فٹ پاتھ پر چلتے ہوے دھیرے سے کسی نے پوچھا،

"وانٹ اے گرل، گڈ گرل!" اس نے بائیں طرف دیکھا۔ معمولی سی قمیض پینٹ پہنے دبلا پتلا آدمی تھا۔ یہ اسی کے الفاظ تھے۔ وہ بڑی بے قرار نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایسا مریل سا دلال پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ اس بات پر حیران ہوا۔ ڈھیر ساری فکروں کی چھاپ لیے ایک ادھیڑ عمر کے آدمی جس کے بال پورے پکے ہوئے تھے۔ جسم ڈھیلا ڈھالا تھا، سے اسے کیا توقع تھی۔ کیا اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہے، جو وہ جوان اور ادھیڑ عمر والے آدمی کے درمیان فرق نہیں کر سکتا تھا۔ شاید اپنے تجربہ سے اسے پکا بھروسہ تھا کہ وہ غلط نہیں ہے۔ اس نے ایک صحیح خریدار کو پہچانا ہے۔

خیر، کوئی جواب دیئے بغیر وہ آگے بڑھا۔ تھوڑی دور جا کر مڑ کر دیکھا تو وہ آدمی کہیں بھی نہیں تھا۔ اس نے آرام کی سانس لی۔

دوسرے دِن شام کو وہ ہوٹل کے کمرے میں تھا تو دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا تو ایک تیس پینتیس سال کی عورت سامنے کھڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہی عورت مُسکرائی۔ اس نے پوچھا، "کیا بات ہے؟ آپ کون ہیں؟"

"مجھے ہوٹل کے منیجر صاحب نے بھیجا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ دروازے کے اندر گئی۔

"پر کیوں؟ میں نے کسی سے نہیں کہا تھا۔" وہ گھبراتے ہوئے بولا۔

"واہ! مجھے کیا معلوم ، پھر کیا یہ باتیں کہی جاتی ہیں؟ ہوٹل والے خود ہی سمجھتے ہیں، کسے کیا چاہیے۔" وہ ایک آواز میں بغیر ہچکچاہٹ کے بولی۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔ دروازہ کھُلا چھوڑ کر وہ نیچے آیا۔ ریسپشن کاؤنٹر کے پاس وہی مریل دلال ہوٹل کے کسی ملازم کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ اس نے پوچھا:

"منیجر کہاں ہیں؟"۔

"منیجر، کیوں کیا بات ہے صاحب؟ لڑکی پسند نہیں ہے کیا؟" ہوٹل کا ملازم بغیر کسی جھجک کے بولا۔

"میں ہوٹل چھوڑ رہا ہوں۔" وہ اُونچی آواز میں بولا۔

"آخر کیوں؟ آپ کل ہی تو آئے ہیں۔ یہاں کس بات کی کمی ہے؟"

" کمی نہیں ہے۔ بس اسی لیے۔" اس کی آواز میں تلخی تھی۔

نوکری

ادارے میں اس سے میلے۔ ایک بجھا بجھا سا چہرہ، دھیمی آواز، نس نس میں نا اُمیدی ہی نا اُمیدی بھری ہوئی ہے۔ اس تے کوئی بھی معمول سے زیادہ کام نہ کرنے کا ارداہ کیا ہے۔ اس کا مطلب ہے، کلاس میں جانا (وقت پر کبھی نہیں)، طے شُدہ اسباق پڑھانا، اِدھر اُدھر کی باتوں سے پرہیز کرنا...... طلبا کو اس سے کوئی بھی شکایت نہین ہے۔ وہ دیر سے ہی کلاس میں نہیں جاتا بلکہ جلدی کلاس چھوڑ بھی دیتا ہے۔ دفتر میں وہ بغیر بلائے نہ پرنسپل سے ملنے جاتا ہے اور نہ دیگر ہم کاروں یا ساتھوں سے۔

ہاں، جیوں ہی موقع ملے تو اپنا کام کر کے وہ ادارے سے کھسک جاتا ہے۔ وقت سے پہلے دفتر سے چلے جانے کے لئے نہ کسی سے اجازت لیتا ہے اور نہ ہی کسی کو اطلاع کرتا ہے۔ افسران جان کر بھی انجانے بنے رہتے ہیں۔ کئی بار انھیں اس کے لیے جھوٹ بھی بولنا پڑتا ہے۔

اس کا ایک دوسرا روپ بھی ہے، بالکل مختلف۔ یہ روپ دفتر کے باہر کا ہے۔ وہ اپنی بیوی کے کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ ہاتھ کیا بٹاتا ہے لگ بھگ سارا کام وہی دیکھتا ہے۔ اس کی بیوی کا کاروبار ریڈی میڈ گارمینٹس سے متعلق ہے۔ اس نے کئی درزی رکھے ہوئے ہیں۔ آرڈر کے مطابق کپڑے سیئے جاتے ہیں اور انھیں بازار میں سپلائی کیا جاتا ہے۔ اس کاروبار میں اچھی خاصی آمدنی ہوتی ہے۔

کسی نے پوچھا، "تم نوکری چھوڑ کر سارا وقت اپنے کاروبار مین کیوں نہیں لگاتے ہو؟" اس کا جواب سیدھا اور صاف تھا، " دیکھیے، نوکری میری سرکاری ہے اور کاروبار میری بیوی کا۔ میں سرکاری نوکری چھوڑ کر بیوی کی نوکری بھلا کیوں کروں؟"

کفارہ

اس چھوٹے سے قصبے کے ایک تاریخی مندر میں اب کی بار باہر سے آئے کسی مہاتما نے یگیہ کرایا تھا۔ دور دور سے عقیدت مند آئے تھے۔ سبھی مہاتما جی کے درشن کرتے تھے اور ان سے آشیرواد لیتے تھے۔

مہاتما جی کو دیکھ کر ہیمال ایک دم ٹھٹھک گئی۔ مہاتما جی کے سر پر سفید بال تھے اور ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ انھوں نے سفید کھادی کا کُرتا پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ انھوں نے ہیمال کو دیکھتے ہی پہچانا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو لگ بھگ تیس سال کے بعد دیکھا ہوگا۔ ہیمال پل بھر کے لئے رُک کر آگے بڑھی۔ مہاتما جی بھی کچھ نہیں بولے۔ ہیمال یگیہ کے پرساد کا انتظار کیے بغیر ہی مند سے نکل کر اپنے گھر لوٹی۔

گھر پہنچ کر ہیمال کو بالکل چین نہ آیا۔ وہ دوبارہ مندر جا کر اسے دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کی خیر و عافیت پوچھنا چاہتی تھی۔ پر اس کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ بغیر کچھ کھائے پیے بستر پر لیٹ گئی۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔

اتنے سال کتنی جلدی گذر گئے تھے۔ وہ اٹھارہ سال کی ہی تھی جب اس کی بڑی بہن اسے اپنے میکے سے سُسرال لے گئی۔ اس کی ماں بہت غریب تھی۔ اسے ہیمال کی شادی کی فکر تھی۔ پر اسے کوئی مناسب رشتہ نہیں مل رہا تھا۔ ہیمال کی بڑی بہن نے ایک رشتہ ڈھونڈا، گوپی ناتھ۔ پر وہ غریب ہونے کی وجہ سے ماں کو پسند نہ آیا۔ بڑی بہن نے اپنی ماں کی مرضی کے خلاف مجبور ہو کر ہمیال اور گوپی ناتھ کی کسی مندر میں چوری چھپے شادی کرا دی۔ اس شادی مین گوپی ناتھ کے کچھ رشتہ دار شامل ہوئے۔

کچھ دِن گذر گئے۔ ہیمال کی ماں کو پتہ چلا۔ وہ مجبور ہو کر خاموش ہو گئی۔ بات سارے علاقے میں پھیل گئی۔ تبھی طوفان سا آیا۔ نزدیکی گانو کے ایک نامی سیٹھ تاراچند کو یہ بات پسند نہ آئی۔ وہ نام نہاد سماج سیوک تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے علاقے میں ایسی بات ہو۔ اس میں سارے علاقے کی بدنامی تھی۔ وہ ہیمال کی ماں سُکھ مال کے پاس گیا۔ اسے سمجھایا کہ اسے تھانے میں رپٹ لکھوانی چاہیے۔ سُکھمال ہچکچائی۔ تارا چند نے اسے تھانے میں رپورٹ درج کرانے کے لیے مجبور کیا۔

بس پھر کیا تھا۔ تارا چند نے باقی کام خود سنبھالا۔ پولیس نے نوبیاہتا ہیمال اور گوپی ناتھ کو گرفتار کیا۔ گوپی ناتھ کو تھانے میں بند کیا گیا اور ہیمال کو اس کی ماں کے حوالے کیا۔ تارا چند ہیمال کی ماں سے ملتا رہا اور اسے صلاح دی کہ بدنامی سے بچنے کے لئے ہیمال کی فوراً شادی کرانی چاہیے۔ تارا چند نے کہا کہ سماج سیوک ہونے کے ناطے وہ خود ہیمال سے شادی کرنے کے لئے تیار ہے۔

تارا چند کی بیوی دو چار سال پہلے مر چکی تھی۔ اس کے تین بڑے بڑے بچّے تھے۔ عمر چالیس پینتالیس سال کی تھی۔

سُکھ مال کچھ ہچکچاہٹ کے بعد راضی ہوئی۔ وہ اپنی غریبی سے تنگ آ چکی تھی۔ اسے ہیمال کے لیے اچھے رشتے کی تلاش تھی۔ تارا چند امیر تھا۔ ہاں، عمر میں کچھ زیادہ تھا۔ ہیمال کی شادی تارا چند سے ہو گئی۔

گوپی ناتھ کو تھانے سے کچھ دنوں کے بعد، تارا چند اور ہیمال کی شادی کے بعد رہا کیا گیا۔ ہیمال اپنی گرہستی کے کاموں میں پھنس گئی۔ وہ گوپی ناتھ کے ساتھ شادی کے واقعہ کو ایک خواب سمجھ کر دھیرے دھیرے بھول گئی۔ اس نے بس اتنا سُنا تھا کہ گوپی ناتھ نے دوبارہ شادی نہیں کی۔ وہ اپنے گھر گانو سے باہر بہت ہی کم جاتا تھا۔ وہ شاید اپنی شادی کے واقع کو بھول نہیں پایا تھا۔ کسی نے یہ بھی کہا کہ اس نے اپنی زمین جائیداد بیچ کر ساری پونجی

مندر کو دان میں دی تھی اور اب وہ سادھو بن کر صرف دھرم کرم کے کاموں میں جُٹ گیا تھا۔

بہت کوشش کرنے کے باوجود ہیمال کو ساری رات نیند نہیں آئی۔ وہ گوپی ناتھ سے ایک بار ملنا چاہتی تھی۔ ہیمال بہت سویرے اُٹھ کر مندر چلی گئی۔ مندر کے پاس ہی چھوٹی دھرم شالا تھی۔ اس نے دیکھا دھرم شالا کے دروازے پر مندر کے پجاری اور دو تین شخص کھڑے تھے۔ انھیں دیکھ کر ہیمال کا دِل نہ جانے کیوں زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ بے قراری سے ان کی طرف بڑھی۔ اس نے پجاری سے پوچھا، "پنڈت جی، کیا بات ہے؟"

"مہاتما جی گذر گئے ہیں۔" پنڈت جی نے جواب دیا۔

"مہاتما جی؟" ہیمال کے رُندھے گلے سے چیخ سی نکلی۔ وہ آگے بڑھی۔ اس کا دِل بہت تیزی سے دھڑکا۔ اسے پسینہ آ گیا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر گوپی ناتھ کی لاش کے پاس بیٹھ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کفارہ کیسے ادا کرے گی۔

رام کہانی

ٹرین ساڑھے چھ بجے صبح کی تھی۔ ٹرین اسی اسٹیشن سے چلنی تھی۔ میں دس پندرہ منٹ پہلے ہی ٹرین میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک قلی کافی سامان لے کر چڑھا۔ تین اٹیچیاں اور کُچھ تھیلے تھے۔ قلی نے اوپر کے برتھ پر سامان رکھا۔ اب کُچھ سواریاں چڑھیں۔ ایک سکھ خاندان کے لوگ تھے۔ لگ بھگ اسی سال کا ایک بوڑھا لاٹھی کے سہارے، دھیرے دھیرے چل کر میری داہنی طرف کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک ادھیڑ عمر کا شخص، اس کی بیوی اور بیس بائیس سال کا ایک لڑکا۔ عورت میری سیٹ کے سامنے کی کھڑکی کے پاس بیٹھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کا خاوند اس کے ساتھ ہی نزدیک بیٹھ گیا۔ اس نے تکیہ اور کمبل کا تھیلا اپنی پیٹھ کے پیچھے رکھا۔ بعد میں ٹرین چلنے پر سامنے کی ہی آدھی خالی والی سیٹ پر لیٹ گیا۔

بوڑھا سیٹ پر سیدھا بیٹھا۔ اس نے اپنی لاٹھی سیٹ کے پیچھے رکھی۔ اس نے ادھیڑ عمر شخص کے سے (جو اس کا بیٹا ہوگا) کوئی چیز مانگی۔ بدلے میں اس ادھیڑ عمر والے شخص نے ایک کالا تھیلا اس کے ہاتھ می تھمایا۔ بوڑھا اس میں سے کوئی چیز ٹٹولتا رہا۔ اس نے کوئی دوائی نکال کر اس تھیلے کو اپنے پاس رکھ لیا۔ میں نے دھیان سے بوڑھے کی طرف دیکھا۔ اس کی ڈاڑھی اور بھویں گھنی اور سفید تھیں۔ اس کے ہاتھ دوائی کا لفافہ کھولتے ہوئے کانپ رہے تھے۔ اس نے تھیلے سے پانی کی ایک چھوٹی بوتل بھی نکالی۔ دوائی کی گولی منھ میں ڈالی اور بوتل سے ہی پانی کے ایک دو گھونٹ پی لیے۔ دوائی کھا کر وہ سامنے کی سیٹ پر بیٹھے ادھیڑ عمر کے سردار سے کچھ پوچھنے لگا۔ وہ تھوڑی دیر کے بعد "ہوں" یا "نہ" میں اس کی باتوں کا جواب دیتا رہا۔

دراصل وہ اپنی بیوی کے ساتھ بات چیت میں مصروف تھا۔ بوڑھا بار بار کچھ پوچھتا رہا پر ادھیڑ عمر والا سردار زیادہ تر ان سنی کرتا رہا۔ اس کی بیوی کی سمجھ میں جیسے کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنے خاوند سے اشاروں میں ہی جیسے بیچ بیچ میں پوچھتی تھی، "آخر یہ کیا کہہ رہا ہے؟" اس کا خاوند باتیں ہانک رہا تھا۔ اسی درمیان بوڑھا دھیمی آواز میں کچھ نہ کچھ بولتا رہا۔

اتنے میں کوئی اسٹیشن آیا۔ بوڑھے نے میری طرف دیکھ کر اسٹیشن کا نام پوچھا۔ میں نے بتایا۔ وہ اپنی سفید ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر مُسکرا کر بولا:

"میں نے اس شہر میں کئی سال نوکری کی ہے۔" سامنے بیٹھے سردار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا، "یہ میرا بیٹا اسی شہر میں پڑھا ہے۔ اس کی ماں پہلے ہی گذر گئی تھی۔" یہ کہہ کر وہ پھر اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے کچھ کہنے لگا۔ لیکن اس نے دھیان نہیں دیا۔

بوڑھے نے تھیلے سے پانی کی بوتل پھر نکالی اور کانپتے ہاتھوں ایک اور گھونٹ پانی پیا۔ وہ پھر کہنے لگا، "میرا ایک ہی بیٹا تھا۔ اسے کانوینٹ اسکول میں داخلہ کرایا۔ اسکول اچھا تھا۔ اسی لیے میں نے اپنا تبادلہ نہیں کرایا۔ پروموشن ملنے پر بھی دوسرے شہر نہیں گیا۔ خیر، ہائی اسکول کا امتحان پاس کرنے کے بعد اس کا پڑھائی میں دِل نہیں لگا۔ پھر کاروبار کرنے لگا۔ شادی کی۔ ان کا بھی ایک ہی بیٹا ہے (سامنے کی سیٹ پر لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ کالج میں ہے۔"

پتہ نہیں وہ مجھے اپنے گھر کی کہانی کیوں بتا رہا تھا۔ بوڑھے آدمی کے میرے ساتھ بات چیت کرنے پر ان کے گھر کے افراد پتہ نہیں کیا سوچتے ہوں گے۔ میں جان بوجھ کر دِلچسپی لے کر نہ بیچ بیچ میں شیشے سے باہر دیکھنے لگا۔

اس کا بیٹا بھی میری طرف دیکھ کر دھیرے سے بولا،

"یہ آپ کو بھی بور کریں گے۔ ان کی رام کہانی آسانی سے ختم نہیں ہو گی۔"

میں نے بوڑھے کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی پُر درد نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

خلا

بس سے اُتر کر وہ بیگ ہاتھ میں لے کر پیدل چل رہا تھا۔ وہ اپنے ہی خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ پیچھے سے ہارن بجا۔ پلٹ کر دیکھا تو ایک سفید ماروتی پاس ہی رُک گئی۔ کار میں شیلجا تھی۔ کار کا شیشہ نیچے کرتے ہوئے شیلجا نے نمستے کی۔ کار کا دروازہ کھولتے ہوئے اندر آنے کے لئے کہا۔ وہ شیلجا کی بغل والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

" کہاں جانا ہے؟" شیلجا نے پوچھا۔ یہ سوال غیر ضروری تھا۔ وہ آسانی سے جان گئی ہوگی کہ اسے کہاں جانا ہوگا۔ پھر بھی بولا:

"بس، اپنے پرانے دفتر تک۔"

" کسی سرکاری کام سے آئے ہوں گے۔"

جی، ایک سیمینار ہے۔ خیر، آپ سُنایئے۔ کیسی ہیں؟"

" گھر آیئے تو بتا دوں گی۔" اس نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

" آپ بہت خوش نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کیسے ہیں۔"

"اچھے ہیں۔ اپنے کام میں ہمیشہ کی طرح مصروف۔" اتنے میں دفتر آ گیا۔ اس نے پوچھا، " کس گیٹ پر اتاروں۔"

" آپ یہیں اتار دیجئے۔ میں پیدل جاؤں گا۔"

"نہیں، ایسے کبھی ہو سکتا ہے۔ میں آپ کو گیٹ تک چھوڑ دوں گی۔"

"اچھا، بہت بہت شکریہ۔"

" کس بات کا؟" شیلجہ نے پوچھا۔

"مجھے برسوں بعد پہچاننے کا۔"

"ابھی تک میری یادداشت برقرار ہے۔ یاد ہے ایک بار آپ نے مجھے تپتی دوپہر کو یونیورسٹی کے گیٹ سے میرے گھر تک اسکوٹر پر بٹھایا تھا؟"

"اوہ! کیا آپ کو اب تک یاد ہے؟"

"کیوں نہیں؟"۔

"پھر وہ بھی یاد ہوگا کہ اسکوٹر پر بیٹھے ہوئے آپ نے کیا کہا تھا؟"

"نہیں، کیا کہا تھا؟"

"یاد کیجئے؟" اس کی آواز میں اصرار تھا۔

"آپ نے میری پنجابی کے بارے میں کچھ کہا تھا۔" رمیش نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"ہاں، مجھے یاد ہے۔ میں نے کہا تھا کہ آپ بہت اچھی پنجابی بولتے ہیں۔ یہی نا؟ اب تو آپ یہاں کے رہے ہی نہیں۔ خیر ہمارے گھر کب آئیں گے؟"

"دیکھوں گا۔ کب وقت ملتا ہے۔ پرسوں واپس جانا ہے۔"

"میں شام کو پانچ بجے آؤں گی، آپ کو گھر لے جانے کے لئے۔" شیلجا کے تحکم آمیز لہجہ کے سامنے رمیش کی کچھ نہ چلی۔ اس نے کہا،

"جیسا آپ کا حکم۔"

شیلجا مُسکرائی اور اس نے اپنی کار موڑی۔ رمیش نے ہاتھ ہلا کر اسے وداع کیا۔

شیلجا کتنی بدل گئی ہے۔ رمیش کو یاد ہے کہ جب ڈاکٹر کُمار کے ساتھ اس کی شادی ہوئی تھی ان دونوں وہ کتنی شرمیلی تھی۔ وہ کسی چھوٹے قصبے کے غریب گھر سے تھی۔ ایم۔اے کرنے کے فوراً بعد کسی پرائیوٹ کالج میں لیکچرر ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کمار کی پہلی بیوی مر چکی تھی۔ اس کے دو بچے تھے۔ شیلجا نے ان بچوں کو اپنایا۔ وہ ان کا خیال رکھنے لگی۔ اس کے اوپر اتنی بڑی ذمہ داری آئی تھی۔ ڈاکٹر کمار اور شیلجا کیمپس پر اکثر سیر کرتے دِکھائی دیتے تھے۔

اس درمیان رمیش کا تبادلہ ہوا۔ ڈاکٹر کمار نے نوکری سے ریٹائرمنٹ لے لیا۔ شیلجا کا تقرر پی۔ایچ۔ڈی کرنے کے بعد اسی شہر کے سرکاری کالج میں ہوا۔ ان کے دونوں بیٹوں کی نوکری لگ گئی۔ دونوں کی شادی ہوئی۔ ایک لڑکا اسی شہر میں سُسرال میں رہنے لگا ہے اور دوسرا کسی اور شہر میں۔

ڈاکٹر کمار اور شلیجا کے گھر پر رمیش کو کئی نئی باتیں پتہ چلیں۔ ڈاکٹر کمار کی کتابیں خوب چھپی ہیں۔ انھیں ایک دو انعامات بھی حاصل ہوئے ہیں۔ شیلجا کی بھی دو کتابیں چھپی ہیں۔

کھانا کھا کر وہ بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ڈاکٹر کمار نے زور دیتے ہوئے کہا، "ہمارے پاس سب کچھ ہے۔ بچے اپنے پانو پر کھڑے ہیں۔ آزاد ہیں۔ میرے پاس کئی کام پڑے ہیں۔ میں انھیں میں لگا ہوں۔ شیلجا کی سرکاری نوکری ہے۔ اس کی دو کتابیں چھپی ہیں۔ اس نے خوب نام کمایا ہے۔ پچھلے دنوں ایک کتاب پر انعام بھی ملا ہے۔"

رمیش نے شیلجا کو مبارک باد دی۔ جواب میں وہ صرف مُسکرائی۔ ڈاکٹر کمار دوسرے کمرے میں گئے۔ اس درمیان رمیش نے شیلجا سے کہا، "اس بات کی مجھے خوشی ہے کہ آپ بہت خوش ہیں۔ آپ کی کتابیں چھپ رہی ہیں۔ انعام مل رہے ہیں......"

"ہاں، خلا پُر کرنے کا یہ اچھا ذریعہ ہے۔" کہتے ہوئے شیلجا کے ہنس مکھ چہرے پر ایک دم مایوسی کی ایک لہر دوڑی۔ شیلجا کے یہ الفاظ سُنتے ہی رمیش کے سارے جسم میں ایک سرسراہٹ سی دوڑ گئی...... اتنے میں ڈاکٹر کمار ایک میڈل اور سرٹیفکیٹ لے کر آئے۔

"یہ دیکھیۓ شیلجا کا انعام۔"

من کی بات

کچھ ہی دنوں میں دونوں ایک دوسرے- کے بہت قریب آ گئے۔ پہلے پڑھائی لکھائی کی باتیں ہوتی رہیں، پھر اِدھر اُدھر کی۔ اور نجی بات ہی کیوں ، اب وہ گھنٹوں ایک ساتھ اُٹھتے بیٹھتے تھے، ساتھ ساتھ کام کرتے تھے اور سیر و تفریح کرتے تھے۔ دونوں میں عمر کا کافی فرق تھا۔ آنند تقریباً پچپاس سال کا تھا اور بیلا چوبیس سال کی۔ دن بہ دن دونوں میں قربت بھی بڑھتی رہی۔ ان کی قربت کو دیکھ کر دفتر میں پاس پڑوس میں سرگوشیاں بھی ہونے لگیں۔ دونوں کو اس کی پروانہ تھی۔ استاد اور شاگردہ کے تعلق کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ واقعی یہ دونوں اس تعلق کی حد کو پار کر گئے تھے۔

آنند بیلا سے زیادہ دیر دور نہیں رہ سکتا تھا۔ بیلا کو کسی سیمینار میں ایک ریسرچ سکالر اُمیش کے ساتھ ممبئی جانا پڑا۔ بیلا اور اُمیش ہم عمر تھے۔ وہ ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے تھے۔ وہ کالج اور یونیورسٹی میں ایک ساتھ رہے تھے۔ دونوں میں کافی دوستی تھی۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی آنند کو نہ معلوم کیوں، یہ بات ناگوار گزری کہ یہ دونوں ایک ساتھ ممبئی جارہے ہیں کسی سیمینار میں۔ کیونکہ یہ سیمینار اہم تھا اور بیلا کو پیپر پیش کرنا تھا اس لئے وہ اسے روک نہ سکے۔

بیلا- اور اُمیش نے سیمینار میں شرکت کی۔ اپنے اپنے پیپر پیش کیے۔ واپس آکر دونوں ایک ساتھ پروفیسر آنند سے ملنے گئے۔ دونوں نے سیمینار کے بارے میں باتیں کیں۔ اپنے پیپروں پر ہوئے بحث مباحثہ کے بارے میں پروفیسر آنند کو بتایا۔ دونوں بہت خوش تھے۔

شام کو جب آنند اور بیلا کی دوبارہ مُلاقات ہوئی۔ آنند بہت بیقرار لگ رہا تھا۔ بڑی بیقراری سے اس نے بیلا سے کہا،

"اُمیش کے ساتھ ممبئی جانے سے تم بہت خوش نظر آرہی ہو۔تم نے خوب انجوائے کیا ہوگا؟"

بیلا بنا سوچے سمجھے بولی،

"ہاں، اچھا لگا۔ سیمینار کا انتظام اچھا تھا۔ وقت اچھا گزرا اور ہمارے پیپر بھی اچھے رہے۔"

"میرا مطلب پیپر سے نہیں ہے۔ اس سفر میں تم دونوں نے ساتھ ساتھ رہ کر خوب عیش کیے ہوں گے۔"

آنند کی معنی خیز مُسکراہٹ اب بیلا سے پوشیدہ نہ رہی۔ وہ سمجھ گئی کہ آنند کے دِل میں کیا ہے۔ اس کو آنند سے یہ امید نہ تھی۔ وہ سنجیدگی سے بولی،

"اوہ، آپ کی بات میں اب سمجھی۔ ایک بات میں کہنا چاہتی ہوں کہ نوجوانوں کے من دوسرے لوگوں سے کئی گُنا صاف ہوتے ہیں۔ ہمارے دِل میں ایسی ذلیل اور فضول باتوں کی کوئی جگہ نہیں۔"

یہ کہتے ہوئے اداس سی بیلا پروفیسر آنند کے کمرے سے باہر نکلی۔

فائدہ

پیٹر اور میں ریلوے سٹیشن کے بینچ پر بیٹھے باتوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ ایک درمیانہ قد والا تقریباً پچاس سال کی عمر کا دبلا پتلا آدمی قریب آکر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا۔ وہ بیٹھتے ہی پیٹر سے مخاطب ہوا،

"آپ کہاں کے ہیں؟ آپ ہندی جانتے ہیں۔" اس کے منہ سے شراب کی بُو آرہی تھی۔ وہ دن میں ہی شراب پیے ہوئے تھا۔

"میں امریکی ہوں۔" پیٹر نے کہا۔

"یہ ہندی کے علاوہ مراٹھی اور کشمیری بھی جانتے ہیں۔" میں نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں بھی ہندی جانتا ہوں۔ تمل میری مادری زبان ہے۔ کنڈا بھی بولتا ہوں۔"

"آپ کیا کرتے ہیں؟" پیٹر نے پوچھا۔

"میں پروفیسر ہوں۔" وہ تھیلا ٹٹولتے ہوئے بولا۔

"پروفیسر! لیکن لگتا ہے آپ نے دن میں ہی شراب پی ہوئی ہے۔" پیٹر نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں، میں نے شراب پی ہے۔ میرے اس تھیلے میں بھی آدھی بوتل ہے۔"

"آپ یہاں سٹیشن پر کیوں آئے شراب پی کر؟"

"میں شراب کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں ایک دوست کو وداع کرنے آیا تھا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے پونا چلا گیا۔ ہم نے لنچ ہوٹل میں ہی کیا تھا۔"

"آپ کو گھر جانا چاہیے تھا۔" میں نے کہا۔

"گھر؟" وہ ہنستے ہوئے بولا، "میرے گھر میں کیا رکھا ہے۔ میں اکثر گھر سے باہر ہی رہتا ہوں۔"

"گھر پر کون کون ہے آپ کے؟" پیٹر نے پوچھا۔

"کہنے کو تو میری بیوی ہے اور ایک بیٹا۔ مگر میری بیوی مجھ سے ہمیشہ لڑتی رہتی ہے۔ میں تنگ آ گیا ہوں گھر سے۔" وہ بولا۔

"آخر کیوں؟ اس لئے کہ آپ شراب پیتے ہیں؟" پیٹر نے سوال کیا۔

"میں گھر سے تنگ آکر ہی شراب پیتا ہوں۔ میری بیوی نوکری کرتی ہے۔ وہ گزیٹڈ آفیسر ہے۔ مجھ سے تنخواہ صرف آدھی پاتی ہے لیکن اپنے کو پتا نہیں کیا سمجھتی ہے۔ اس نے بیٹے کو بھی اپنی طرف کر لیا ہے۔"

"بیٹا کتنا بڑا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ دسویں جماعت میں پڑھتا ہے۔ پندرہ سال کا ہے۔"

"کیا آپ کا بیٹا آپ دونوں کی لڑائی سے پریشان نہیں ہوتا؟" پیٹر نے پوچھا۔

"وہ بہت پریشان رہتا تھا۔ ہمارے لڑائی جھگڑے سے بہت ناراض ہوتا تھا۔ روتا پیٹتا تھا۔ لیکن اب وہ اپنی ماں کا ہی ساتھ دیتا ہے۔ وہ مجھ سے بات بھی نہیں کرتا۔" وہ بولا،

"میرا خیال ہے، قصور آپ کا ہے۔ کوئی بھی بیوی اپنے شرابی شوہر کے ساتھ کیسے خوش رہ سکتی ہے۔ آخر آپ شراب پینا چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟"

"کئی بار کوشش کی۔ اب یہ میری عادت بن گئی ہے۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

"کیا آپ نے علاج کرایا؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ سال پہلے علاج کرایا تھا۔ شراب کچھ کم ہوئی۔ لیکن پھر عادت پڑ گئی۔

دوائیاں سب بے کار ہیں، دل کا سکون ہونا چاہیے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔آپ بیوی سے مشورہ کیوں نہیں کرتے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ صلاح بہت لوگوں نے دی۔ااپ بھی دے رہے ہیں۔ میں نے کوشش بھی کی، لیکن کوئی فائدہ نہیں۔"

" لگتا ہے،آپ کے ساتھ بات کرنا فضول ہے۔" پیٹر بولا۔

"میں کون سی بات کرنا چاہتا ہوں۔" یہ کہکر وہ جھٹ سے تھیلا اٹھا کر چل پڑا۔ وہ کچھ دور جا کر ایک دوسرے بینچ پر بیٹھ گیا، جہاں دو آدمی پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔

ورک شاپ

منجیت کو کسی ورک شاپ میں حصہ لینے کے لئے مدعو کیا گیا۔ خط پڑھ کر وہ بہت خوش ہوا۔ اس لئے نہیں کہ اسے ایسے مواقع نہیں ملتے بلکہ اس لئے کہ یہ دعوت نامہ نرملا کا تھا جو ایک تعلیمی ادارے کی پرنسپل تھی۔ نرملا کا خط پڑھتے ہی جیسے اس کے جسم میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ نرملا اس کی ہم جماعت تھی۔ وہ نرملا جس کے ساتھ وہ بات کرنے کو ترستا رہتا تھا، جس پر اس نے نظمیں کہی تھیں اور بدلے میں اسے ایسی بیہودہ حرکتوں کے لیے ڈانٹ ہی ملتی تھی۔ نرملا نے ایک بار ڈانٹتے ہوئے کہا تھا" کیا تم یہ فضول نظمیں کہنے کے علاوہ کوئی اور کام نہیں کر سکتے؟"

منجیت کو یہ سن کر دھکا لگا۔

ایم۔اے۔ کا امتحان پاس کرنے کے بعد ان کے راستے الگ الگ ہو گئے۔ الگ الگ شہروں میں رہنے لگے۔ دونوں کی نوکریاں لگیں اپنے اپنے شہروں میں۔

منجیت نے کئی بار نرملا سے ملنے کی کوشش کی۔ نرملا ٹالتی رہی۔ ایک بار وہ اس کے گھر بھی گیا۔ اس نے شادی کرنے کی تجویز رکھی لیکن نرملا نے اسے نامنظور کر دیا۔ منجیت کی شادی ہوئی۔ اس نے اپنی شادی کا دعوت نامہ بھی نرملا کو بھیجا۔ بدلے میں نرملا نے مبارکباد کا تار بھیجا۔

نرملا اپنے کاموں میں مصروف رہی۔ نوکری کرنے ساتھ ساتھ اس نے اعلیٰ تعلیم جاری رکھی۔ اسے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل ہوئی۔ جب اخبار میں یہ اطلاع شائع ہوئی تو منجیت نے اسے مبارکباد کا تار بھیجا۔ اس نے اس کا جواب نہیں دیا۔ جب اس کی پہلی کتاب شائع ہوئی تو اُس کے بارے میں منجیت نے ایک تعریفی خط لکھا۔ نرملا نے اسے

جواب میں کتاب بھیجی اپنے دستخط کے ساتھ۔

جب برسوں بعد نرملا اس تعلیمی ادارے کی پرنسپل ہوئی تو منجیت اسے مبارکباد دینے کے لئے آیا۔

وہ ایک نزدیکی شہر میں ایک کالج میں لیکچرر تھا۔ اس نے اپنی نظموں کا مجموعہ نرملا کو پیش کیا۔ نرملا نے جب نظمیں پڑھیں تو ان میں وہ نظمیں بھی شامل تھیں جو اس نے بہت پہلے کہی تھیں۔ نرملا کو یہ نظمیں اب اچھی لگیں۔

آج برسوں کے بعد منجیت کو نرملا کا بھیجا ہوا سرکاری دعوت نامہ مِلا۔ ورک شاپ میں حصہ لینے کی دعوت۔ ورک شاپ میں کچھ نصابی اسباق تیار کرنے تھے۔

منجیت ورک شاپ میں آیا۔ سب سے پہلے وہ نرملا سے ملنے اس کے آفس میں گیا۔ نرملا نے مُسکرا کر اس کا استقبال کیا۔ آج بھی اس کی آنکھوں میں وہی کشش تھی جس کا بیان وہ اپنی نظموں میں کیا کرتا تھا۔

ورک شاپ میں تقریباً بیس لیکچرر تھے۔ وہ ورک شاپ کی ڈائرکٹر تھی۔ اس نے کام سمجھایا۔ سبھی اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ منجیت بہت ہی سنجیدگی کے ساتھ دِل لگا کر کام کرتا رہا۔ وہ سب سے پہلے ادارے میں آتا اور سب سے آخر میں جاتا۔ وہ لنچ بریک میں بھی تنہا کام کرتا رہتا۔ منجیت کی سنجیدگی دیکھ کر وہ حیران تھی۔ اس نے منجیت سے رسمی طور پر پوچھا،

"کیسا کام چل رہا ہے؟"

"بہت اچھا!"

"تُم کافی سنجیدگی سے کام کر رہے ہو؟"

"ہاں، بس تمھیں یہ بتانے کے لئے کہ نظمیں کہنے کے علاوہ میں دوسرے سنجیدہ کام بھی کر سکتا ہوں۔" منجیت نرملا کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔

انیتا

انیتا بچپن سے ہی اپنی مرضی کی مالک تھی۔ جو کچھ بھی کرنا چاہتی تھی بغیر کسی روک ٹوک کے۔ والد صاحب انجنیئر تھے اور والدہ کالج میں پڑھاتی تھیں۔ پیسوں کی کوئی تنگی نہ تھی۔ وہ خوب خرچ کرتی تھی۔ جب کالج میں آئی تو اس کے دوستوں اور سہیلیوں کی تعداد بڑھ گئی۔ وہ خوب صورت، ہنس مکھ، ملنسار، چلبلی اور حاضر جواب تھی۔ باتوں سے دِل جیت لیتی تھی۔

بی۔ایس۔سی پاس کرنے کے فوراً بعد انیتا نے ایک کمپیوٹر کورس میں داخلہ لیا۔ یہاں اس کی ملاقات انل سے ہوئی۔ انل نے چینئی سے ایم۔سی۔اے کیا تھا اور وہ یہاں کمپیوٹر کورس پڑھاتا تھا۔ انل لگ بھگ پچیس سال کا تھا۔ وہ ہنس مکھ تھا۔ انیتا انل کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہنے لگے۔ کچھ ہی دنوں میں وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے۔ وہ ایک ساتھ پارٹیوں میں جانے لگے۔

انل ایک مڈل کلاس سندھی خاندان سے تھا۔ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا۔ وہ چینئی میں رہتا تھا۔ نوکری کرنے بنگلور آیا تھا۔

جب انیتا نے اپنے والدین سے انل کے ساتھ شادی کی بات کی تو وہ تذبذب میں پڑ گئے۔ انھوں نے برسوں پہلے دل ہی دل میں سنیل کو داماد بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ سنیل انیتا کے ماموں کا لڑا تھا۔ وہ انیتا سے دو سال بڑا تھا۔ وہ دونوں ایک ساتھ پلے بڑھے تھے۔ وہ ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ بچپن انھوں نے ساتھ ساتھ گزارا تھا۔ آپس میں خوب بنتی تھی۔

دونوں خاندانوں میں گہرے تعلقات تھے۔ ابھی دونوں کے درمیان شادی کرنے کی رسمی بات نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی دونوں خاندانوں کی یہی خواہش تھی۔ سنیل نے آئی۔آئی۔ٹی۔ سے کمپیوٹر کے ساتھ انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ ڈگری حاصل کرنے کے فوراً بعد اسے بنگلور کی ایک امریکی سوفٹ ویر کمپنی میں نوکری مل گئی تھی۔ سنیل بہت ہی شریف لڑکا تھا۔ وہ عقلمند اور محنتی تھا۔

انیتا کی سنیل سے بہت اچھی دوستی تھی لیکن وہ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ سنیل انیتا کو پسند کرتا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کی خواہش کے بارے میں جانتا تھا۔ وہ انیتا کو ایک سچا دوست سمجھتا تھا اور اس سے صلاح مشورہ بھی کرتا تھا۔ انیتا نے سنیل سے انل کے بارے میں بات کی۔ انل کے ساتھ شادی کرنے کی اپنی خواہش ظاہر کی۔ سنیل کے من کو دھکا لگا لیکن اسے نے اپنے دل کی کیفیت کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اس نے انیتا کو یقین دلایا کہ وہ اس کی مدد کرے گا۔ انیتا کے ماں باپ نہیں مانے۔ انل کے گھر والوں کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ انیتا نے اور انل نے کورٹ میرج کرنے کی ٹھان لی۔ انل کے گھر والے کورٹ میرج کے لئے راضی نہ تھے۔ خیر، کوئی چارہ نہ تھا۔ انیتا اور انل کی کورٹ میرج ہوئی۔ انیتا کی طرف سے صرف سنیل تھا۔ اور انل کے والدین موجود تھے۔

شادی کے فوراً بعد انیتا اور انل ہنی مون کے لئے دو دن کے لئے اوٹی گئے۔ وہاں سے پھر چینئی۔ انل کا ایک چھوٹا سا مکان تھا جس میں انل کے والدین اور اس کی ایک چھوٹی بہن رہتی تھی۔ انل کے والد کا چھوٹا موٹا کاروبار تھا۔ اس نے کل پانچ دِن کی چھٹی لی تھی۔ وہ چینئی میں دو دن رہا اور پھر بنگلور چلا گیا۔ انیتا کے ساس سُسر انیتا کو کچھ دن روکنا چاہتے تھے۔ ان کے کچھ رشتہ دار بھی بہو کو دیکھنے کے لئے اندور سے آنے والے تھے۔

انل کے بنگلور جانے کے بعد انیتا کا اس کے گھر میں دم گھٹنے لگا۔ وہ یہاں ایک پل بھی نہیں رہنا چاہتی تھی۔ اس نے ٹیلیفون پر انل سے کہا کہ وہ یہاں نہیں رہ سکتی۔ انل نے

کہا کہ وہ ایک ہفتے کے بعد آئے گا اور پھر اسے بنگلور لے جائے گا۔ دو دن بیت گئے۔ انل کے رشتہ دار اندور سے آئے جن میں انل کے ماموں اور ممانی شامل تھے۔ وہ روز انل سے ٹیلیفون پر بات کرتی تھی۔ سنیل کو بھی ٹیلیفون کیا۔ اسے اپنے والدین کی یاد آنے لگی۔ وہ اس سے ناراض تھے۔ اس کو لگا کہ اس نے اپنے ماں باپ کی مرضی کے خلاف انل سے شادی کر کے بہت ہی بڑی بھول کی ہے۔ وہ دن رات تنہائی میں آنسو بہانے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟ وہ اداس تھی۔ انل اس کا دکھ نہیں سمجھا تھا۔ وہ ٹیلیفون پر بار بار کہتا تھا کہ اسے اپنے ساس سسر کے پاس ہنسی خوشی کچھ دِن گزارنے چاہیں۔

انیتا کو یہاں ایک ایک پل گزارنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس کی گھٹن اتنی بڑھ گئی کہ اس نے انل کے لوٹنے سے پہلے ہی یہ گھر چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ آج وہ رات بھر سو نہ پائی تھی۔

وہ صبح تیار ہوئی۔ اس نے ساس سسر سے کہا کہ اسے کسی ضروری کام سے بنگلور جانا ہے۔ انھوں نے اسے روکنا چاہا لیکن ان کی نہیں چلی۔ اسٹیشن پہنچ کر اس نے انل کو ٹیلیفون کرنے کی کوشش کی لیکن وہ دفتر میں موجود نہ تھا۔ انیتا اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی۔ اس کے والدین اسے دیکھ کر حیران ہوئے۔ وہ روتے ہوئے ان سے لپٹ گئی۔

شام کو اس نے انل کو ٹیلیفون کیا۔ انل کو گھر سے اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی۔ وہ بہت ہی غصے میں تھا۔ انیتا رسیور رکھ کر زور زور سے رونے لگی۔ اسے لگا کہ سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔

واقعی سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ انیتا نے اپنے والدین سے مشورہ کر کے بھاری من سے طلاق لینے کے لئے کورٹ میں کیس درج کیا۔ انل کو بھی اعتراض نہ تھا۔ طلاق ہوا۔

اس درمیان سنیل امریکہ جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اسے نیویارک میں نوکری مل گئی تھی۔ سنیل کے ماں باپ اس کے امریکہ جانے سے پہلے اس کی شادی کرانا چاہتے تھے۔ انیتا کے ماں باپ کی ہمت نہ تھی کہ وہ انیتا کی سنیل سے رشتے کی بات کرتے۔ سنیل کے

والدین نے پہل کی۔ سنیل تیار ہو گیا۔ انیتا کو منایا گیا۔

انیتا اور سنیل کی سیدھے سادے ڈھنگ سے شادی ہوئی۔ انیتا ابھی دماغی تناؤ سے آزاد نہ تھی۔ سنیل نے اسے تسلی دی......

سنیل شادی کے دو ہفتے کے بعد امریکہ چلا گیا۔ انیتا کا تین مہینے کے بعد جانا طے ہوا تھا۔ انیتا کے من کا بوجھ ابھی تک ہلکا نہیں ہوا تھا۔ انل کو پل بھر کے لئے بھی بھلانا مشکل تھا۔ اس درمیان انل بنگلور سے چینئی چلا گیا۔ اسے وہاں کسی بڑی کمپیوٹر کمپنی میں نوکری مل گئی تھی۔ انیتا انل سے ملنا چاہتی تھی۔ اسی مقصد سے اس نے انل کو ٹیلیفون کیا۔ بہت ہی اصرار کرنے کے بعد انل نے اس سے ملنے کے لئے بنگلور آنا قبول کیا۔

انیتا اس سے ملنے ہوٹل گئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ انل نے اسے صوفے پر بٹھایا اور بغیر کچھ بولے اس کے سر کو اپنے سینے سے لگایا۔ انیتا بہت دیر تک پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ انل کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھر گئیں۔ روتے روتے ہی انیتا نے بھرائی ہوئی آواز میں انل سے معافی کی درخواست کی۔ انل نے کہا، "جو ہونا تھا، سو ہو گیا۔ اب تم خوش رہو۔ یہی میری دعا ہے۔"

انیتا کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہہ نکلی۔ صوفے پر بیٹھے ہی انل نے اسے چھاتی سے لگا لیا۔ انیتا کو لگا جیسے اس کے من کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔

وقت کیسے گذر گیا، انھیں اس کا احساس نہ تھا۔ آخر انیتا گھر جانے کے لئے تیار ہوئی۔ انل نے پوچھا کی،

" کیا تُم رات بھر کے لئے رُک نہیں سکتیں؟" انیتا نے جواب دیا،

"نہیں، آج نہیں، پھر کبھی۔"

انیتا جب گھر لوٹی تو اس کے من سے جیسے ایک بوجھ اتر گیا تھا۔ اس کے اندر پھر جینے کی خواہش جاگ گئی تھی۔

نظر

اس کے پاس ہر سوال کا جواب تھا۔ کسی نے پوچھا:

"اگر تمھاری بیوی تم سے لمبی ہو گی تو کیا ہو گا؟"

"ہو گا کیا؟ وہ نظر جھکا کر میری طرف دیکھا کرے گی اور میں نظر اٹھا کر اس کی طرف۔"

"اگر کچھ الٹا ہوا تو؟"

"صرف کردار بدل جائیں گے، نظریں نہیں بدلیں گی۔"

"اگر دونوں کی لمبائی برابر ہو؟"

"پھر نظر ملانا مشکل ہو گا۔ چشمہ لگانا پڑے گا۔"

" کون سا؟"

"دونوں طرح کے۔ دھوپ کا دن میں۔ نظر کا صبح اور شام۔"

"اور رات کو؟"

"ضرورت نہیں ہے۔ نیند کا بہانہ کرنا ہی کافی ہو گا۔"

خواب گھر کا

بڑے بھائی نے ایک مہینے کے اندر اندر گھر خالی کرنے۔کے لئے کہا۔ انجو حیران رہ گئی۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ بات یہاں تک پہنچ جائے گی۔ قانونی طور سے بات صحیح ہے کہ مکان پرساد کے نام پر ہی تھا۔ پرساد کے والد کا عمر بھر کا خواب تھا کہ وہ اس شہر میں ایک گھر بنائے جس میں اس کا خاندان رہ سکے۔ وہ کسی دور کے گانو سے یہاں آیا تھا۔ اس کی تعلیم دسویں تک تھی۔ کسی سرکاری دفتر میں وہ کلرک تھا۔ اس نے شادی کی۔ بچے ہوئے۔ اس نے کرائے کے کئی مکان بدلے تھے۔ اگر کسی بات سے وہ دکھی تھا تو بس اس بات سے کہ ہر دوسرے تیسرے سال اسے مکان بدلنا پڑتا تھا۔ اس کا ایک خواب تھا گھر بنانے کا۔ اس کی ترقی ہوئی۔ خاندان بڑا تھا۔ تین بیٹے اور دو بیٹیاں۔

ریٹائر ہونے سے پہلے اس نے اپنی بڑی بیٹی کی شادی کی۔ پرساد کو انجنیئر نگ کالج میں داخلہ کرایا۔ پرساد کی تعلیم پوری ہوئی تو رماکانت ریٹائر ہُوا۔ ریٹائر ہوتے ہی اس نے ایک پلاٹ خریدا۔ پرساد کے نام پر۔ وہ اب فرصت سے مکان بنانا چاہتا تھا۔ وہ تیاری میں لگا ہی تھا کہ اوپر سے بلاوا آ گیا۔ وہ چل بسا۔ گھر پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ پرساد کو کسی پرائیوٹ کمپنی میں نوکری مل گئی۔ انجو پی۔ایچ۔ڈی کر رہی تھی۔ اسے فیلوشپ مل رہی تھی۔ انجو کی چھوٹی بہن کالج میں پڑھتی تھی۔ اور سب سے چھوٹا بھائی اسکول میں پڑھتا تھا۔ گھر کا سارا بوجھ پرساد اور انجو پر تھا۔ ان کی ماں کو تھوڑی بہت پنشن مل رہی تھی۔ پرساد اپنے والد کا خواب پورا کرنا چاہتا تھا مکان بنانے کا۔ اس نے اپنے والد کی جمع پونجی اور پنشن کی رقم مکان پر لگا دی اور چار کمروں کا ایک مکان کھڑا کیا۔

پرساد کو اب سرکاری نوکری مل گئی تھی۔ اس کی تنخواہ دگنی ہوئی۔ اس کی شادی ہوئی۔ اس کی بیوی بھی سرکاری نوکر تھی۔ انجو کو پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری مل گئی۔ وہ ایک کالج میں پارٹ ٹائم لیکچرر ہوگئی۔ انجو اپنی ساری تنخواہ گھر کے خرچ پر لگاتی رہی۔

سارا گھر خوش تھا۔ پرساد اور اس کی بیوی گیتا دونوں اپنی اپنی نوکری میں مصروف تھے۔ انجو کالج جاتی تھی پڑھانے کے لئے۔ چونکہ نوکری پارٹ ٹائم تھی اس لئے وہ گھر کا سارا کام کاج بھی کرتی رہی۔

گھر بار کی ساری ذمہ داری لگ بھگ انجو پر تھی۔ پرساد ہر مہینے صرف دو ہزار روپئے گھر کے خرچ کے لئے دیتا تھا۔ ماں کی پنشن ایک ہزار تھی اور انجو کو اپنی ساری تنخواہ گھر پر ہی خرچ کرنا پڑتی تھی۔

پرساد اور گیتا کے دو بچے ہوئے۔ انجو پر ان کی بھی ذمہ داری تھی۔ گھر کا خرچ بڑھ گیا۔ انجو بڑی مشکل سے گھر کا خرچ چلاتی تھی۔ پرساد نے زیادہ پیسے دینے سے انکار کر دیا۔ انجو کے پاس شادی کے بارے میں سوچنے کا بھی وقت نہ تھا۔ ایک دو رشتے آئے لیکن پرساد نے کوئی دلچسپی نہ لی۔ انجو بھی اپنے اوپر سارے گھر کی ذمہ داریاں دیکھ کر اس کے لئے تیار نہیں تھی۔ انجو اپنی چھوٹی بہن انو کی شادی کرانا چاہتی تھی۔

لیکن اب وہ کریگی کیا؟ اس کے پاس رہنے تک کی جگہ نہ تھی۔ راستے میں دور تک تاریکی ہی تاریکی پھیلی تھی۔ دور تک کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا......

عمر کٹی ہے

اسے اس بات کا احساس نہیں کہ اس کا بچپن جوانی میں، جوانی ادھیڑ پن میں اور۔ ادھیڑ پن بڑھاپے میں کیسے بدلتا رہا۔ عمر تو لگ بھگ ساری کٹی ہے۔ لیکن اس نے زندگی نہیں گزاری۔ عمر کٹنے میں اور زندگی جینے میں کتنا اہم فرق ہے۔ کاش! اس کا اسے پہلے کبھی احساس ہوا ہوتا۔

آج اس کا جوان بیٹا اس سے سوال کرتا ہے۔

"آخر آپ نے زندگی میں کیا حاصل کیا ہے؟ نہ جائیداد بنائی ہے اور نہ پیسے ہی بچائے ہیں۔"

اس کے بیٹے کے لئے جائیداد اور نقد پیسے ہی زندگی جینے کا نچوڑ ہے۔ ایسا نہیں کہ اس نے پیسے نہیں کمائے، اس نے خوب کمائے تھے۔ اس کی نوکری اچھی تھی۔ نوکری میں ترقی بھی ملی تھی۔ وہ ایک اچھی پوسٹ سے ریٹائر ہوا۔ اسے اپنی نوکری میں عزت ملی۔ اس کی ایمانداری، محنت اور کسی کی بھی مدد کرنے کے مزاج سے سبھی خوش تھے۔ وہ اپنے اصولوں کا پکا تھا۔ وہ موقع ملنے پر گھر کے لوگوں، قریبی رشتہ داروں اور یہاں تک کہ دور کے رشتہ داروں کی بھی مدد کرتا رہا۔ کچھ کو اعلیٰ تعلیم دلائی، کچھ کی ذاتی مشکلات دور کرنے میں مدد کی۔ خیر، ان باتوں سے اس کے جوان بیٹے کو کیا مطلب! وہ اپنے والد کی جمع پونجی کو آنکنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ جب اس نے اپنے بیٹے سے کہنا چاہا کہ اس کے کندھوں پر کافی ذمہ داریوں کا بوجھ رہا ہے تو وہ سوال پر سوال کرتا رہا۔

"اس سے آپ کو کیا ملا؟ یہ ذمہ داریاں کیوں اٹھائیں؟ اپنے بچوں کے مستقبل

کے بارے میں سوچا کیوں نہیں؟"

وہ کہنا چاہتا تھا کہ اس کے ماں باپ غریب تھے۔ ان کے پاس صرف دال روٹی کا گزارہ تھا۔ کسی طرح اس نے وظیفے کے سہارے اور پارٹ ٹائم نوکری کر کے اپنی تعلیم مکمل کی۔ اتنا ہی نہیں اپنی بہن کی شادی میں بھی اس نے اپنے ماں باپ کی مالی مدد کی۔ اپنے چھوٹے بھائیوں کو پڑھایا۔ وہ سب اب خود کفیل ہیں۔

وہ بہت کچھ کہہ سکتا تھا۔ لیکن سنے گا کون۔ بیٹے کی ایک ہی رٹ برقرار رہی، "اس سے آپ کو کیا ملا؟" وہ اپنے بیٹے کو مطمئن نہ کر سکا۔ آخر میں ہار کر کہا "تم شاید صحیح کہتے ہو، میں نے ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے عمر گزار دی لیکن اپنی زندگی نہیں جی سکا۔ اب تمھارا زمانہ ہے۔ تم پوری طرح سے آزاد ہو۔ میں تُم پر کوئی ذمہ داری نہیں چھوڑ رہا ہوں۔ تُم اپنی زندگی جی لینا۔"

اس نے اپنے بیٹے کو اعلا تعلیم دلائی۔ اس کی نوکری لگی۔ اس کی شادی کی۔ وہ آج شادی کرنے کے فوراً بعد ایک نئے شہر میں جا رہا ہے اپنی بیوی کے ساتھ۔ وہ خود اپنے کسی دوست سے ملنے دوسرے کسی شہر جا رہا ہے۔ اسے اب کسی اپنے کی تلاش ہے۔

پرواز کے دوران

دلّی کی اڑان کے لئے چیک ان کرنے کے بعد میں کاؤنٹر کے پاس ہی ایک کُرسی پر بیٹھا تھا۔ وہ ایک ہینڈ بیگ لے کر کاؤنٹر پر آئی۔ اس کے لئے سب کی توجہ اپنی طرف کرنا آسان تھا۔ اس کی عمر تیس سال کے آس پاس تھی۔ ناک نقشہ تیکھا تھا۔ بال گردن تک کٹے تھے۔ اس نے بلیو جینز اور ایک چیک کوٹ پہنا تھا۔ وہ سیدھی کاؤنٹر پر گئی اور چیک ان کر کے پاس ہی ایک کتابوں کی دُکان میں گھس گئی۔

دلّی کی فلائٹ کے لئے سیکیورٹی چیک کا علان ہوا۔ میں سیکیورٹی چیک کے گیٹ کی طرف بڑھا۔ وہ بھی پہنچی اور اندر داخل ہوئی۔

میں اندر جاکر لاؤنج میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہاں کئی کُرسیاں خالی تھیں۔ وہ بیٹھی نہیں۔ کھڑے کھڑے وہ جیسے سبھی موجود مسافروں کا جائزہ لے رہی تھی۔ لگتا تھا کہ اس کی نظریں بھیڑ میں کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ میرے پیچھے کی صف میں کسی بلیو سوٹ پہنے ادھیڑ عمر کے شخص کو دیکھ کر اس نے دور سے ہی ہاتھ ہلایا۔ اسے دیکھ کر اس کے چہرے پر چمک سی آئی تھی۔ وہ اس کی طرف تیزی سے بڑھی۔ اس آدمی نے کھڑے ہو کر اس سے ہاتھ ملایا۔ دونوں بیٹھ گئے۔ میں نے ان کی بات چیت سُننے کی کوشش کی۔ لیکن صاف صاف سُن نہ پایا۔ وہ کسی پارٹی یا بزنس میٹنگ کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ دلّی کے لئے جہاز کی روانگی کا اعلان ہوا۔ سبھی مسافر جہاز کی طرف بڑھے۔ میری کھڑکی والی سیٹ تھی۔ میں نے اوپر لگے لاکر میں اپنا بریف کیس رکھا اور اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ پھر دِکھائی دی۔ وہ اپنی خاص رفتار سے آگے بڑھی۔ اس نے میری سیٹ کے پاس کے کھلے لاکر میں اپنا

ہینڈ بیگ رکھا اور میری سیٹ کی صف کی آیل سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ہماری بیچ والی سیٹ خالی تھی۔ میری بے صبری بڑھی۔ میں نے ایک اخبار اٹھایا اور اس کی سرخیوں کو سرسری طور پر پڑھنے لگا۔ اس کا چہرہ کچھ جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ مجھے یاد نہیں آرہا تھا کہ میں نے کبھی اسے پہلے دیکھا ہو۔

اچانک وہ انگریزی میں بڑبڑائی "اوہ یہاں مچھر ہیں۔" میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنا پیر کھجلا رہی تھی۔ اس نے ایک اونچی ایڑی کا سینڈل پہنا ہوا تھا۔ میں نے مُسکراتے ہوئے کہا "جی ہاں، یہ ہر جگہ ہیں۔ یہ سارے بھارت کا سفر کرتے ہیں۔" اس نے پوچھا،

" کیا آپ کشمیری ہیں؟"

"جی ہاں، لیکن آپ کو کیسے پتہ چلا؟" میں نے پوچھا۔

" آپ کے لہجے سے۔"

"اوہ، آج تک کبھی کسی نے مجھے لہجے سے نہیں پہچانا۔"

"میں بھی آدھی کشمیری ہوں۔"

" آدھی کشمیری؟ مطلب؟"

"میرا کان دیکھیے۔" اس نے اپنے دائیں کان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کے کان میں چھید تھا اور اس نے ایک سونے کی بالی پہنی تھی۔ اس کا کیا مطلب؟ میں نے سوچا۔ کوئی بھی عورت اپنے کانوں کو چھدوا سکتی ہے۔ وہ پھر بولی،

"میرے والد کشمیری ہیں اور میری والدہ جرمن ہیں۔ میری پیدائش اور پرورش جرمنی میں ہوئی ہے۔ میں جرمن شہری ہوں۔"

ظاہر ہے اس کا ناک نقشہ کشمیری ناک نقشے سے ملتا جلتا تھا اسی لیے شاید وہ جانی پہچانی سی لگ رہی تھی۔ میں نے پوچھا،

"آپ بھارت کیسے آئیں؟"

"میں ایک جرمن بین الاقوامی کمپنی میں نوکری کرتی ہوں اور آج کل میری پوسٹنگ دِلّی میں ہے۔"

میری جاننے کی خواہش اور بڑھی۔

"آپ نے بھارت آنے کا فیصلہ کیوں کیا؟"

"یہ ایک چیلنج والی پوسٹ ہے۔ مجھے زیادہ تر مردوں کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے اور مجھے مردوں پر حکومت کرنا اچھا لگتا ہے۔" اس نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

بات چیت کا موضوع اب مرد تھا۔ اس نے کہا کہ وہ کسی فرانسیسی نوجوان سے شادی کرنا چاہتی تھی مگر اس کا منگیتر جرمن ہے۔

"آخر فرانسیسی ہی کیوں؟" میں نے پوچھا۔

وہ بڑے مہذب ہوتے ہیں اور آسانی سے ہی کسی کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔"

"جرمن کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

جرمنی آسانی سے دوست نہیں بنتے۔ مگر جب وہ دوست بنتے ہیں تو ان سے چھٹکارا پانا آسان نہیں ہوتا۔ اسی لئے میں ایک جرمن سے بندھ گئی۔"

"ہندوستانیوں کے بارے میں کوئی تجربہ؟"

"ہندوستانی! اُف! وہ بڑی جلدی سے آپ کے قریب آتے ہیں۔ وہ بہت سی پزیسو ہوتے ہیں۔ جو رشتے جلدی میں بنائے جاتے ہیں وہ اکثر اتنی ہی جلدی سے ٹوٹ بھی جاتے ہیں۔" اس کے خیالات کافی حد تک صحیح تھے۔

بات بھارتیوں کے کام کی چلی۔ مردوں کے بارے میں اس کی رائے ٹھیک نہیں تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ مرد افسر خود پسند، مغرور اور اسٹیٹس کانشیس ہوتے ہیں وہ صرف حکم چلانا جانتے ہیں۔ اپنی ذمہ داریاں دوسروں پر تھوپتے ہیں۔ وہ اقتدار کے بھوکے ہوتے

ہیں۔ وہ اپنے ادارے میں کام کرنے والے مردوں کی سخت نقاد تھی۔ اس کے مطابق وہ عورتوں کو اپنے برابر نہیں سمجھتے۔ وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ جیسے انھوں نے اپنی قابلیت کی بنا پر ہی اعلیٰ عہدے حاصل کیے ہیں اور عورتوں کو ترقی کسی دوسری وجہ سے ملتی ہے۔

وہ بہت ہی پکی فیمینسٹ لگ رہی تھی۔ وہ زیادہ تر بولتی رہی اور میں سُنتا رہا۔ اب میں صبر کھونے لگا۔ میں نے معاشیات کے بارے میں سوال کیا۔ اس کو ایک اور نکتہ ملا اور کہا کہ اس کو پکا یقین ہے کہ معاشی ترقی تب ممکن ہو گی جب مرد اور عورتیں برابر کے حصہ دار ہوں اور عورتوں کے ساتھ امتیاز نہیں برتا جائے گا۔

میری قوت برداشت پھر ختم ہو گئی۔ میں نے کہا، "اچھا اب دِلّی کی بات کرتے ہیں۔ آپ کو دِلّی میں رہنا کیسا لگتا ہے؟"

"دِلّی! توبہ! توبہ یقین کیجیے میں ہوش وحواس کھو دیتی ہوں جب مجھے گھر سے دفتر تک اور دفتر سے گھر تک کار میں سفر کرنا پڑتا ہے۔ چاروں طرف آلودگی اور شور شرابا ہے، گندگی ہے۔ مگر دِلّی میں کچھ اچھے ہوٹل اور ریستوراں بھی ہیں۔ اس سے مجھے یاد آرہا ہے، کل رات کو میرا ایک فرانسیسی کے ساتھ ہوٹل تاج میں ڈیٹ ہے۔ میں اس فرانسیسی سے کچھ دن پہلے کلکتہ سے دلی آتے ہوئے جہاز میں ملی۔ وہ بہت اچھا ہے۔ اس نے پیرس واپس جانے کا سفر ایک دن کے لئے ملتوی کیا تاکہ وہ مجھے ڈنر پر لے جا سکے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا، "وہ بہت خوش قسمت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ خوب لطف اندوز ہوں گی۔ یہ سُنتے ہی اس نے میرا بایاں ہاتھ اپنے ہاتھ سے دبایا اور چلبلے انداز میں مسکرائی۔

جیوں ہی ہم دلی کے ائرپورٹ سے باہر آئے، ایک وردی پوش سکھ نوجوان ڈرائیور کار لے کر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس نے میری طرف ہاتھ ہلایا۔

کسی نے نہیں سُنی

جمال کی نہ شکل صورت اچھی تھی اور نہ ہی پڑھا لکھا تھا۔ ناٹا ہونے کی وجہ سے اسے "بھانڈ" کہتے تھے۔ جمال بھانڈ۔ اس کا باپ ایک سیدھا سادا کسان تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی جمال بھی اسی کام میں لگ گیا تھا۔

جمال پندرہ سال کا تھا کہ اس کی شادی ہوگئی۔ سسرال کھڈونی میں تھا۔ کھڈونی ملاحوں کے لئے مشہور ہے۔ ناؤ کے ملاح اور مچھلی بیچنے والے ملاح۔ زیبا اُسی کی عمر کی تھی مگر وہ جمال سے تھوڑی لمبی تھی۔ شکل صورت سے بھی اچھی تھی۔ شادی کے بعد جمال کی حالت ہی بدل گئی۔ وہ پھولے نہیں سما رہا تھا۔

سسرال میں آتے ہی زیبا نے گھر کا رنگ ڈھنگ ہی بدل دیا۔ وہ صبح سے شام تک گھر کا کام کرتی رہتی۔ اس نے کھانا پکانے، چوکا برتن کرنے، گھر کی صفائی، کپڑے دھونا وغیرہ کی ساری ذمہ داری سنبھالی۔ پاس پڑوس میں صجان ملک کے گھر کی سدھرتی حالت چھپی نہ رہی۔ زیبا کے سگھڑپن پر بہت سے لوگوں کو حسد ہوا اور کچھ اس کی تعریف کرتے رہے۔ جمال کے ماں باپ بھی بہت خوش تھے۔ صجان ملک کا عمر بھر کا میل ڈھل گیا۔ تاجا بھی اب صاف ستھرے کپڑے پہننے لگی۔ جمال کی تو بات ہی مت پوچھیے۔ اس کی ٹوپی بھی اب ترچھی رہتی تھی۔

زیبا اپنے گھر پر جان نچھاور کرتی رہی۔ گھر کے کام کے علاوہ وہ اپنے خاوند اور سسر کے لئے کھیتوں پر دوپہر کو کھانا لے جاتی تھی اور شام کو چائے بھی۔ گھر کے جانوروں کا خیال رکھتی تھی۔ ان کے لیے چارا لاتی تھی۔

پہلے پہل زیبا اپنے گھر کے کاموں میں اتنی مصروف رہی کہ اسے اپنے پاس پڑوس والوں کے ساتھ بات کرنے تک کا وقت نہیں ملتا تھا۔ دھیرے دھیرے محلے کی بہوؤں اور بیٹیوں نے اس کے پاس آنا جانا شروع کر دیا۔ زیبا سب کی مدد کرتی رہی۔ وہ کھلے دل سے سب سے بولتی چالتی تھی۔ زیبا کے گھر کی دیکھا دیکھی پاس پڑوس کے لوگوں کے گھروں کی حالت بھی سدھرنے لگی۔ سبھی پڑوسی زیبا کی تعریف کرتے تھے۔

وقت گزرتا گیا۔ زیبا کے بچے ہوئے۔ اس کی ذمہ داریاں زیادہ بڑھ گئیں۔ اس نے بچوں کو اسکول بھیجا۔ وہ بچوں کو اچھی تعلیم دِلانا چاہتی تھی۔ خود پڑھی لکھی نہ تھی اس لیے گھر پر اپنے بچوں کو پڑھا نہیں سکتی تھی۔ زیبا نے اسی گانو کے ماسٹر موہن لال سے درخواست کی کہ وہ رشید کو اسکول کے بعد گھر پر پڑھایا کرے۔ موہن لال ٹیوشن نہیں کرتا تھا لیکن زیبا سے وہ انکار نہ کر سکا۔ رشید شام کو موہن لال کے گھر پڑھنے کے لئے جانے لگا۔ موہن لال نے زیبا سے پیسے نہیں لیے۔ زیبا کہاں مانتی، وہ موہن لال کے گھر کسی نہ کسی بہانے چھوٹی موٹی چیزیں بھیجتی رہتی مثلاً دالیں، راجما، انڈے، سبزیاں وغیرہ۔

رشید پڑھنے میں اچھا تھا۔ موہن لال نے اس کی رہنمائی کی۔ وہ دسویں جماعت میں پڑھ رہا تھا کہ کشمیر کے حالات بدل گئے۔ دہشت گردوں کے خوف سے ہر نزدیکی گانو سے ہندو بھاگنے لگے۔ اس گانو میں ہندوؤں کے کُل دس بارہ گھر ہی تھے۔ موہن لال بھی ایک رات کو ٹرک میں گھر کا سامان لاد کر بھاگ گیا۔ جب اس گانو میں سے ہندوؤں نے جانا شروع کیا تو زیبا کے دل کو بہت ہی دھکا لگا۔ وہ زار زار رونے لگی۔ اس نے ایک ایک کر کے سب کو روکنے کی کوشش کی،

"اپنا گھر چھوڑ کر مت جایئے۔ ہم آپ کے لیے اپنی جان تک دے دیں گے۔ پہلے وہ ہمیں مار ڈالیں گے بعد میں آپ کو۔"

افسوس! کسی نے اس کا کہنا نہ مانا۔ چاروں طرف حالات بگڑ گئے تھے۔

اس گانو میں سبھی ہندوؤں کے گھر خالی ہو گئے، پندرہ دِن کے اندر ہی ہندوؤں کے گھروں کو جلا بھی دیا گیا۔ سامان سارا لوٹ لیا گیا۔ کہتے ہیں کہ آگ لگانے والے سامان لوٹنے والے دوسرے گانو سے آئے تھے۔ سچ کیا اور جھوٹ کیا؟ کہتے ہیں کہ اس وقت بھی زیبا کو جنون آیا تھا۔ وہ پاگل سی ہوگئی تھی۔ وہ سامان لوٹنے والوں اور آگ لگانے والوں کو زور زور سے گالیاں دینے لگی۔ اس کی بات کسی نہ سُنی۔

اس کے فوراً بعد اس پر ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ زیبا کا بیٹا رشید کسی رشتہ دار کے یہاں گیا تھا ایک نزدیک کے گانو میں۔ اس کو دہشت گروں نے مار ڈالا۔ اس کے جسم کو گولیوں سے بھون ڈالا۔ زیبا کی حالت زخمی شیرنی کی طرح ہوگئی۔ وہ پاگل سی ہوگئی۔ پاس پڑوس کے لوگ چوری چھپے اس سے ہمدردی دکھانے لگے۔ سارے گانو میں دہشت پھیل گئی تھی۔ زیبا کا دل پوری طرح ٹوٹ گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ سارا دن ندی کے کنارے بیٹھ کر ہندوؤں کے جلے ہوئے گھروں کو ٹکٹکی لگا کر دیکھتی رہتی ہے۔ اس کو اپنے بیٹے کی گولیوں سے چھلنی ہوئی لاش اسی راکھ کے ڈھیر میں لٹکتی نظر آتی ہے۔

کھلونا

وہ جلدی میں کوئی چیز ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے کمرے کی تمام چیزیں الٹ پلٹ کر دیں۔ ماں کو آواز دی۔

"ماں، میں نے میز پر کوئی چیز رکھی تھی۔ کہاں ہے؟"

"مٹی کا کھلونا؟" ماں نے پوچھا۔

"ماں وہ مٹی کا کھلونا نہیں ہے۔ کہاں ہے؟"

"بیٹا میں صفائی کر رہی تھی، وہ ٹوٹ گیا۔ میں نے پھینک دیا۔"

ماں کے الفاظ سنتے ہی رمیش آگ بگولہ ہو گیا۔ وہ چلایا۔ "ماں تُم گنوّار ہو۔ تمھیں چیزوں کی قمیت کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔ وہ انمول تحفہ تھا۔ سویتا نے خود بنایا تھا میرے لیے۔"

سویتا رمیش کے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔ دونوں میں دوستی تھی۔ کالج میں دن میں تو ساتھ ساتھ رہتے ہی تھے شام کو بھی وہ دونوں اکثر بڑی دیر تک ٹیلیفون پر باتیں کرتے تھے۔

ماں نے دیکھا رمیش غصے میں تھا۔ اسے پتہ تھا کہ اس کا غصہ آسانی سے اُترتا نہیں۔ وہ دل ہی دل میں سوچتی رہی۔ رمیش چوبیس سال کا ہے۔ ابھی تک اس میں بچپنا باقی ہے۔ ایک مٹی کے کھلونے کے ٹوٹنے پر اتنا غصہ! وہ اپنے ہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ رمیش بڑ بڑاتے ہوئے بغیر کچھ کھائے پیے گھر سے باہر نکل گیا۔ ماں نے روکنا چاہا، پر روک نہ سکی۔

ماں نے کوڑے دان سے اس مٹی کے کھلونے کو ڈھونڈ نکالا۔ یہ کسی جنگلی جانور کی مورت تھی۔ دو ٹانگیں ٹوٹ گئی تھیں۔ اس نے ٹانگوں کو جوڑنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ملی۔

رمیش رات کو دیر سے گھر پہنچا۔ ماں کی بار بار ضد کرنے پر بھی اس نے کھانا نہیں کھایا۔ ماں بھی بغیر کچھ کھائے پیے سو گئی۔ صبح بھی یہی حال رہا۔ رمیش نہا دھو کر بغیر کچھ کھائے پیے گھر سے نکل گیا۔

ماں سے اب برداشت نہ ہوا۔ وہ خود کو کوسنے لگی کہ اس سے وہ مٹی کا کھلونا کیوں ٹوٹ گیا۔ اس نے سویتا کو ٹیلیفون کیا اور اس کو ساری بات بتائی۔ سویتا نے اسے بتایا کہ اس نے وہ مٹی کا کھلونا خود نہیں بنایا تھا بلکہ ایک نزدیکی گانو کی دُکان سے خریدا تھا۔

ماں بغیر کھائے پیے گھر سے چل دی۔ اسکوٹر لے کر اسی گانو میں گئی۔ وہاں ہو بہو اسی رنگ کا کھلونا خرید کر لائی۔ کل پانچ روپیے میں۔ گھر آکر اس نے کھلونے کو رمیش کی میز پر رکھ دیا اور رمیش کے گھر آنے کا بے صبری سے انتظار کرنے لگی۔

شام کو رمیش دیر سے تھکا ہارا گھر لوٹا۔ اس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ لگتا تھا کہ اس نے باہر بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں گیا۔ ماں بھی اس کے پیچھے پیچھے گئی۔ رمیش نے میز پر کھلونا دیکھا، اسے اٹھا کر فرش پر زور سے پٹک کر توڑ دیا۔ کھولنا توڑ کر وہ اپنی ماں کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اسکول

نومنتخب مکھیا نے گانو-والوں سے خطاب کیا۔ اس نے کہا،

"سب سے پہلے گانو میں اسکول کھلوانا لازمی ہے۔ اسکول کی بلڈنگ ہو گی تو اپنے گانو میں ہی ووٹ ڈالنے کے لئے پولنگ بوتھ کھل سکتا ہے۔ گانو والوں کو دوسرے کسی گانو جانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اسی طرح وقت بوقت پولیو اور چیچک کی روک تھام کے لئے انجکشن بھی گانو کے بچّوں کو یہاں ہی لگ سکتے ہیں۔ اسکول کا گراؤنڈ ہو گا تو گانو کے لڑکے یہیں کرکٹ کھیل سکتے ہیں، کبڈی کھیل سکتے ہیں اور دوسرے کھیل بھی۔ انھیں دوسرے گانو میں جانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ گانو کے تہوار بھی یہاں پر ہی منائے جائیں گے۔

ایک بات اور۔ دوسرے بڑے گانوؤں میں کم سے کم ایک ماسٹر رہتا ہے اس سے اس گانو کی عزت بڑھتی ہے۔ گانو میں ماسٹر کا ہونا بہت فائدہ مند ہے۔ ماسٹر گانو والوں کی چٹھیاں لکھ پڑھ سکتا ہے۔ گانو کے چھوٹے موٹے جھگڑوں کا فیصلہ کر سکتا ہے۔"

آخر میں اس نے کہا "اسکول ہو گا تو بچّے بھی اس میں داخلہ لے سکتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی تو پڑھے گا ہی۔ اس لئے ہم اسکول کھلوانے کے لئے کل ایم۔ ایل۔ اے کے پاس جائیں گے۔" گانو والے اسکول کھلوانے کے لیے تیار ہو گئے۔

قیمت

کاٹھ منڈو ہم کسی بین الاقوامی کانفرس کے سلسلے میں آئے تھے۔ کانفرس تین دِن کی تھی۔ کانفرس میں مختلف ملکوں سے تقریباً سو لوگ شریک تھے۔ ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرنے کا انتظام تھا۔ ہوٹل شہر کے بیچ میں تھا۔

پہلے دِن ہوٹل سے شام کو ہم گھومنے نکلے۔ بازار غیر ملکی سیاحوں سے بھرا ہوا تھا۔ چاروں طرف خوب رونق تھی۔ دکانوں کی آرائش دیکھ کر روی کا دل مچل اٹھا۔ اسے دکانوں میں رکھی تمام چیزیں اپنی طرف کھینچنے لگیں۔ وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے دکانوں میں داخل ہو کر کئی چیزوں کے دام پوچھتا رہا۔ بڑے اشتیاق سے کئی چیزوں کو چھوتا، چیزیں الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ اس طرح وہ کئی دکانوں میں جا کر صرف قیمتیں معلوم کرتا رہا۔ جیب میں رکھی نوٹ بک میں کچھ چیزوں کی قیمت درج کرتا رہا۔ زیادہ تر دکانیں ریڈی میڈ گارمنٹس، سوویئرس، برتنوں، کراکری اور الیکٹرانک سامان کی تھی۔

ہم کچھ دور آگے بڑھے۔ بازار میں سبزیوں اور پھلوں کی دکانیں آئیں۔ روی بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ان کی طرف بھی لپکا۔ آلو، پیاز، گوبھی، سیب، کیلے، انگور وغیرہ کی قیمتیں پوچھتا رہا۔ میں نے اسے روکنا چاہا لیکن وہ مانا نہیں۔

بات یہاں تک ہی نہیں رہی۔ وہ ٹیکسی والوں، رکشا والوں اور ہوٹل والوں سے کرایے کی دریں معلوم کرتا رہا۔ ریستوراں والوں اور خوانچے والوں سے قیمتیں پوچھتا رہا، پتہ نہیں کس کس چیز کی۔ اس نے تھوڑے ہی وقت میں تمام قیمتیں معلوم کر لی تھیں۔

اس کے ساتھ گھومتے ہوئے میں کافی تنگ آ گیا۔ آخر وہ یہ سب کیوں کر رہا ہے؟

نہ اسے چیزیں خریدنی تھیں نہ سبزیاں اور نہ پھل۔ میں نے تھوڑے سے غصہ میں پوچھا،

"آخر یہ کیوں کر رہے ہو؟" اس کا جواب تھا،

"بس یونہی۔ بھارت کی قیمتوں سے مقابلہ کر رہا ہوں۔"

"اس کا فائدہ؟" اس کا سیدھا جواب تھا،

"یہاں کے رہن سہن کی سطح جاننے کے لیے۔"

کانفرنس کے دوران بھی جب اسے موقع ملتا تو یہاں وہ ٹیچروں اور ریسرچ اسکالروں کی تنخواہ اور دیگر آمدنی کے بارے میں بھی واقفیت حاصل کرتا رہتا۔

کانفرس میں اس نے اپنا مقالہ پڑھا۔ سوالوں کے جواب دینے میں اس کی کوئی دلچسپی نہ تھی اور نہ اس نے ہی کسی سے کوئی سوال پوچھا۔

تین دن کی کانفرنس کے بعد اس کے پاس کاٹھ منڈو کے بارے میں پوری معلومات تھیں۔ وہ اپنے کو ماہر سمجھنے لگا۔ اسے قیمتوں کے بارے میں واقفیت حاصل کرنے اور جانکاری دینے میں خاص دِلچسپی تھی۔ وہ بھارت لوٹنے پر اپنے ادارے میں کاٹھ منڈو کی قیمتوں پر تقریر کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔

جس دن ہم واپس آ رہے تھے، میری فلائٹ تین بجے کی تھی اور اس کی پانچ بجے۔ وہ اس دن صبح بازار گیا کچھ خریدنے کے لئے۔ مجھے زیادہ کچھ خریدنا نہ تھا۔ میں ائرپورٹ جانے سے پہلے نزدیک کے بازار میں گیا۔ دو چار چھوٹی موٹی چیزیں خریدیں، دو تین سوویزس اور ایک چینی چھتری۔ میری فلائٹ تھوڑی لیٹ ہوئی۔ میں ائرپورٹ کے لاؤنج میں انتظار کر رہا تھا کہ روی دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک نئی چھتری تھی۔ اس نے کہا کہ اس نے کاٹھ منڈو میں ایک ایسی جگہ ڈھونڈ نکالی ہے جہاں چیزیں سستی ملتی ہیں۔ اسی لئے وہ صبح ہی وہاں شاپنگ کرنے گیا تھا۔ اس نے کہا کہ نمونے کے طور پر اس نے یہ چھتری صرف دو سو روپے میں خریدی ہے۔ "دو سو روپیے؟" میں نے اپنے ہینڈ بیگ سے اپنی

چھتری نکالی جو ہو بہو اس کی چھتری سے ملتی تھی اور کہا:

"میں نے سرف ڈیڑھ سو روپے میں خریدی ہے۔"

"سچ؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے کئی دکانوں سے قیمت پوچھی، پھر خریدی ہے۔"

میں نے مسکراتے ہوے کہا، "ہو سکتا ہے کہ میری چھتری نقلی ہو۔" اس کے چہرے پر مایوسی سی نظر آ رہی تھی۔

دوست

وہ ان نایاب اور خاص شخصیتوں میں سے ہے جو نزدیک ہونے پر بھی نزدیک نہیں ہوتے۔ انھیں اپنے قبضہ میں لاکر بھی سنبھالا نہیں جاتا۔ مٹھی میں آکر بھی وہ کھسک جاتے ہیں۔

یہ کہانی کئی سال پہلے شروع ہوئی اور کہانی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ بات لڑکپن سے شروع ہوئی۔ بھارت کے ایک گرد آلود تاریخی شہر میں وہ اجنبی بن کر آیا۔ اپنی زبان اور تہذیب کو کوسوں پیچھے چھوڑ کر ایک ڈگری کی تلاش میں۔ پتہ نہیں اس تاریخی شہر میں لوگ کیوں چلتے پھرتے کھنڈر اور بے جان استوپوں کی طرح اسے دِکھائی دیتے تھے۔ لوگوں کا رویہ اور بات چیت کرنے کا لہجہ کھنڈروں کی طرح انوکھا لگتا تھا۔

اتنے بڑے شہر میں وہ تنہائی کا شِکار تھا۔ دعا سلام کرنے کے لیے جاننے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی رہی۔ لیکن وہ پھر بھی اکیلا سا محسوس کرتا۔

اسی دوران سمیر سے تعارف ہوا۔ پہلی ہی مُلاقات میں اسے لگا کہ اسے ایک من چاہا دوست مل گیا۔ اسی تعارف نے اس کے دل میں ایک نئی آرزو کو جنم دیا۔ جیسے سب کچھ بدلنے والا ہو۔ لیکن کچھ ہی دن کے بعد اسے لگا کہ ایسا کچھ بھی ہونے والا نہیں ہے۔ وہ جتنا سمیر کے قریب آنا چاہتا تھا، دوری اور بڑھتی جاتی تھی۔ بات چیت بھی صرف رسمی ہوتی رہی۔ سمیر ہمیشہ کئی لوگوں سے گِھرا رہتا تھا۔ ان میں کئی ہم عمر لڑکیاں اور لڑکے شامل تھے جو ایک دوسرے کے مقابلے میں کبھی کچھ قدم آگے ہو جاتے تھے اور کبھی پیچھے۔ افواہوں کا بول بالا تھا۔ ہاں، ان ہم عمر لوگوں میں زیادہ خطرہ ان سے تھا جو عمر میں بڑے تھے اور اس

ادارے کے افسر کہلاتے تھے۔ جواہر کو لگتا تھا سمیر کے کندھوں پر ذمہ داریوں کا بوجھ کبھی کم ہونے والا نہیں تھا۔ وہ جب بھی سمیر سے ملنے جاتا تو دیکھتا کہ زیادہ تر وہ اپنے کمرے میں ڈیسک پر فائلوں کے کام میں مصروف رہتا۔ اس کے ڈیسک پر بڑھتے کام کے علاوہ جاننے والوں یا دوستوں کے آنے جانے کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ یہ سب دیکھ کر جواہر کے دِل میں سمیر کے لئے ہمدردی پیدا ہوتی۔ وہ ایک سچے دوست کی حیثیت سے اس کے کندھوں کے جوبھ کو ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن کرتا کیا؟ اسے سمیر کا کام کرنے کا اختیار حاصل نہ تھا اور نہ یہ سب کر ہی سکتا تھا۔ جواہر کو لگتا تھا کہ سمیر کی کام میں مصروفیت اور اس کے دیگر دوست ان کے بیچ میں ایک مضبوط دیوار بنے ہیں۔

ایک معمولی سے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود سمیر کو پورے ادارے میں مرکزی حیثیت حاسل تھی۔ وہ سب کے دھیان کو اپنی طرف کھنچا کرتا تھا۔ خیر، جواہر نے ہمت نہیں ہاری۔ سمیر کے قریب آنے کی پوری کوشش کرتا رہا۔ ادارے میں سمیر کی قربت حاصل کرنے والوں کے ہجوم کو جیتنے کے لئے اسے ایک تدبیر سوجھی۔ وہ چھٹیوں میں سمیر کے گھر آنے جانے لگا۔ گھر پر بھی وہ سمیر کو ہمیشہ خالی نہیں پاتا تھا۔ سمیر گھر میں بھی سب سے الگ نظر آتا تھا۔

سمیر کی شخصیت...... دبلا پتلا جسم، گورا رنگ اور تیکھا ناک نقشہ۔ کسی کو بھی اپنی طرف کھنچ لیتی تھی۔ اس کا لباس بھی بالکل مختلف ہوتا تھا۔ رنگ روپ اور لباس کے علاوہ اس کے چلنے کے انداز اور نرم لہجے میں بات چیت کرنے میں بھی جاذبیت تھی۔ اس تاریخی شہر میں بے شعور بے ہنگم نوجوانوں کو تو یہ سب باتیں اپنی طرف کھینچتی رہی تھیں، اس سے بھی زیادہ لڑکیوں کو۔ شاید وہ اس میں اپنے اپنے من میں لبے آدرش بتوں کا زندہ روپ دیکھتی تھیں۔

لیکن پوری کوشش کرنے کے باوجود بھی جواہر سمیر کے قریب نہ آسکا۔ اس کے

لئے اصل میں دو شخص ذمہ دار تھے۔ سریش اور جیوتی۔ سریش اور جیوتی، سمیر کو ہمیشہ گھیرے رہتے تھے۔ وہ دونوں اکثر اس کے گھر بھی آیا جایا کرتے تھے۔ جواہر اور سریش کی کبھی نہ بنی۔ جواہر حیران تھا کہ سمیر سریش کے چکر میں کیوں آ گیا۔ سریش کی چالاکی کے سامنے جواہر کو ہار ماننی پڑی۔ ایک وجہ اور بھی تھی جیوتی۔

جواہر اگر کسی دوسرے شخص سے تھوڑا سا بھی قریب آیا تھا، وہ تھی پریتی۔ پریتی اور جیوتی دونوں کسی دور دراز کے صوبے سے تعلیم حاسل کرنے آئی تھیں۔ دونوں سہیلیاں تھیں۔ جیوتی سریش کے چنگل میں پھنس گئی تھی۔ سریش نے کوشش کی کہ سمیر پریتی کے قریب آ جائے۔ جواہر کو پریتی اچھی لگتی تھی۔ بس ایک دوست کی حیثیت سے۔ کبھی کبھی دونوں میں اِدھر اُدھر کے موضوعات پر بات چیت بھی ہوتی تھی۔ ایک دِن جواہر نے پریتی اور سمیر کو ایک سائیکل رِکشا پر بیٹھ کر بازار جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ دوسری رِکشا پر سریش اور جیوتی تھے۔ جواہر کو بہت بُرا لگا۔ سریش اسے پہلے ہی اچھا نہیں لگتا تھا آج سمیر اور پریتی کے بارے میں بھی اس کا من بدل گیا تھا۔

جواہر کو پھر چاروں طرف کھنڈر ہی کھنڈر نظر آنے لگے۔ اس کی ریسرچ ختم ہوئی۔ ڈگری ملنے کا انتظار کیے بغیر اس نے وہ شہر چھوڑ دیا۔

وقت گزرتا گیا۔ برسوں بعد سمیر اور جواہر ایک ہی ادارے کے مختلف مراکز میں کام کرنے لگے۔ ملاقات پر پرانی یادیں تازہ ہونے لگیں۔ سمیر بہت کم بدلا تھا۔ اب اس کا اپنا گھر تھا۔ ایرا اور دو بچے۔ ایرا نے کیسے اسے جیتا، اس سے ہمیں کوئی مطلب نہیں۔ ہاں، لگتا ہے سمیر نہیں بدلا۔ وہ ایرا اور بچوں کے قریب رہ کر بھی پتہ نہیں کیوں اپنے کو الگ رکھنے میں کامیاب ہوا ہے۔ اس کی عادتوں میں کم تبدیلی آئی ہے۔ جواہر اور سمیر لمبے لمبے وقفے کے بعد جب کبھی ملتے تو پرانی باتوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھیں۔

جواہر دِل ہی دِل میں اب بھی سمیر کو اپنا دوست سمجھتا تھا۔ اس کے ساتھ بات

چیت کرنا اسے اچھا لگتا تھا۔ جواہر کا تبادلہ کسی اور وزارت کے تعلیمی ادارہ میں ہوگیا۔ اس کے یہاں ایک جگہ خالی تھی۔ اس نے سمیر کا تقرر کرایا۔

جواہر خوش تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ دونوں پھر گہرے دوست بن جائیں گے۔ دونوں میں قربت بڑھی۔ یہ قربت ظاہری تھی۔ اس بالکل نئی جگہ میں بھی سمیر کو مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ ظاہری قربت بھی دھیرے دھیرے کم ہونے لگی۔ جواہر پھر لاچار سا ہوگیا۔ اس نے اپنے اکیلے پن کو بھرنا چاہا۔ اس کے لیے پوری کوشش کی لیکن ایسا نہیں ہوا۔

آج سمیر وداع ہو کر جا رہا ہے۔ وہ اپنے پرانے شہر واپس جا رہا ہے۔ شاید وہاں بھی کئی تنہا دِلوں کو رِجھانے کے لئے یا ان کا خالی پن بھرنے کے لئے۔

اُسے میری نظر لگ گئی

جیسے تیسے بس سرینگر اڈے سے اننت ناگ کی طرف ساڑھے نو بجے روانہ ہوئی۔ مجھے ڈرائیور کے پیچھے والی سیٹ ملی۔ کئی دِنوں کی ہڑتال کے بعد اننت ناگ کے لئے یہ پہلی بس تھی۔ بس کھچا کھچ بھر گئی۔ بس ڈل گیٹ کے سٹاپ پر رُکی اور وہاں کچھ اور سواریاں چڑھیں۔ ایک بائیس تیئس سال کی خوبصورت عورت ایک چھوٹی بچّی کے ساتھ بس میں سوار ہوئی۔ عورت کے چہرے پر ہلکا میک اپ تھا اور اس نے شلوار قمیض پر ایک گہرے رنگ کی شال اوڑھی ہوئی تھی۔ چھوٹی بچّی کے ہاتھ میں آلو کے چپس کا پیکٹ تھا۔ عورت نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور چھوٹی بچّی سے بولی، " کوئی بھی سیٹ خالی نہیں ہے۔" واقعی کوئی بھی سیٹ خالی نہ تھی۔ وہ چھوٹی بچّی کا ہاتھ پکڑ کر بونیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں نے دائیں بائیں نظر دوڑائی۔ کسی نے اس کے لئے سیٹ خالی نہ کی۔ ایک زمانہ تھا کہ عورتوں کو بس میں کھڑا نہیں رہنا پڑتا تھا۔ ان کے بیٹھنے کے لئے سیٹیں خالی کی جاتی تھی۔ مگر اب وہ بات کیاں! لوگ اب تعلیم یافتہ ہیں، باشعور ہیں اور انھیں اپنے حقوق کا علم ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ جمہوریت میں مردوں اور عورتوں کو برابر کے حقوق حاصل ہیں۔ اِس عورت کو بھی اس بات کا احساس ہے۔ اسی لئے وہ کوئی سیٹ خالی نہ پا کر سیدھے بونیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ جیسے وہ سیٹ اس کے لئے ہی محفوظ ہو۔

سنجیدہ ہونے کے باوجود وہ پُر کشش تھی۔ اس کی طرف نظریں اٹھ جانا فطری تھا۔ میں جیسے کوئی پہچان نکالنے کی کوشش میں تھا۔ جب جب نظر ملتی تھی، میں دوسری جانب دیکھنے لگا۔ مجھے وہ کسی کہانی کے کردار جیسی نظر آنے لگی جو عام لوگوں میں کھو گئی تھی۔

کنڈکٹر نے کرایہ وصول کیا۔ اسے اونتی پور تک جانا تھا۔ اونتی پور! معلوم نہیں وہاں اس کا کون ہے؟ شاید نوکری کرتی ہو گی۔ مگر کون سی نوکری؟ اس کا ہلکا میک اپ، لمبی پتلی بھویں، چہرے کا ہلکا گلابی رنگ (کچھ اپنا اور کچھ پاؤڈر کا)، ہلکی سرمئی آنکھیں دیکھ کر ظاہر ہوتا تھا کہ اس کا تعلق ایک ایسے کھاتے پیتے خاندان سے ہے جس میں بہوؤں کو سج سنور کر رہنے کے علاوہ گھر میں اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ اس کا شوہر کسی بڑے عہدہ پر ہو گا۔ اس نے تعلیم حاصل کرنے پر بھی کوئی نوکری نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ میں انہیں خیالوں میں غرق تھا کہ اچانک اندھیرا سا چھا گیا۔

جیسے ہی بس بٹوار کے نزدیک پہنچی تو بس پر پتھراؤ ہوا۔ بس کے شیشے ٹوٹ کے اندر بکھر گئے۔ وہ عورت بونیٹ سے نیچے گر گئی۔ ایک دم کہرام مچ گیا۔ ڈرائیور بنا رو کے بس آگے دوڑھاتا رہا۔ کچھ سواریاں چلا رہی تھیں "ٹھہرو" اور کچھ "چلتے رہو"۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ کئی سواریوں کو چوٹیں آئیں۔ میرے بائیں کان کے پاس شیشے کا ٹکڑا لگنے سے چوٹ آگئی تھی۔

عورت سنبھل کر اٹھی۔ اس کے کندھے پر ایک بڑا نوکیلا پتھر لگ گیا تھا اور کھڑکی کے شیشے کے ٹکڑوں سے چہرے پر بہت سے زخم آگئے تھے۔ زخموں سے خون بہہ رہا تھا۔ اپنی سیٹ سے کھڑے ہوتے ہوئے میں نے اسے سیٹ پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ لیکن مجھ سے پہلے ہی میری دائیں طرف بیٹھے نوجوان نے سیٹ خالی کر دی۔ اس نے ہم دونوں کو بیٹھنے کے لئے کہا۔

میری بائیں کنپٹی کے پاس بھی شیشے کا ٹکڑا لگنے کی وجہ سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے جیب سے رومال نکالا اور خون پونچھنے لگا۔ اتنے میں میرے نزدیک کھڑا ہوا نوجوان اخبار کے کاغذ کے ٹکڑے سے اس عورت کے چہرے سے خون صاف کرنے لگا۔ اس کے ماتھے پر، گال پر اور دائیں کنپٹی پر زخم آئے تھے۔ خون زیادہ بہہ رہا تھا۔ میں اپنا زخم بھول کر رومال

سے اس کے زخموں کا خون پونچھنے لگا۔ خون رُکا نہیں۔ میں نے اپنے بیگ میں سے ایک کاغذ نکال کر اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے اس کے زخموں پر لگا دئے۔ میرے قریب کھڑا نوجوان بھی میری مدد کرنے لگا۔

وہ اپنے ہاتھ سے دائیں کندھے کو سہلا کر بولی،

"اس میں شدید چوٹ آئی ہے۔" میں نے اس کا کندھا ہلکے ہلکے دبایا تو اسے تھوڑی سی راحت ملی۔ میں کافی دیر تک ہلکے ہلکے اس کا کندھا دباتا رہا۔

میں سوچ رہا تھا کہ یہ کیا ہوا؟ اس کا کندھا دباتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا،

"اب کندھے میں زیادہ درد تو نہیں ہے؟" اس کی آنکھیں ایک دم آنسوؤں سے بھر گئیں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کے رونے سے میرا حوصلہ بھی پست ہو گیا۔ مجھے بے حد افسوس ہو رہا تھا۔ میرے نزدیک کھڑے نوجوان نے اس سے کہا، "فکر مت کرو۔ ہم تمہارے بھائی ہیں۔ مسلمان اور ہندو سب برابر ہیں۔ ہم تمہارے لئے جان بھی دیدیں گے۔"

اس مسلمان نوجوان کے تسلی کے یہ الفاظ سُن کر میری آنکھیں بھی بھر آئیں۔ میں نے رومال کے ایک صاف کونے سے اس کی آنکھیں پونچھیں۔ آنسوؤں کے ساتھ کالے سرے کا رنگ بھی مل گیا۔ پورے رومال پر خون کے دھبے تھے۔ میں نے ہمت کر کے کہا،

"آپ فکر مت کیجیے۔" اس کے علاوہ میں کچھ نہ کہہ سکا۔ مجھے یہ فکر تھی کہ بس پر آگے بھی کہیں پتھراؤ ہو سکتا ہے۔ معلوم نہیں آج کیا ہو جائے گا۔ وہ بھی کانپ رہی تھی۔ اس نے میرے نزدیک نوجوان سے درخواست کی کہ وہ کھڑکی کی طرف سیٹ پر بیٹھے۔ وہ اسی سیٹ پر آدھا سمٹ کر بیٹھ گیا۔

چند ہی منٹوں کے اس سفر میں کتنا اپناپن پیدا ہو گیا تھا۔ میں اب اس کی گود میں

بیٹھی بچّی کے سر کے بالوں میں سے شیشے کی کرچیاں انگلیوں سے نکال رہا تھا۔ اس بچّی کو کوئی خاص چوٹ نہیں آئی تھی مگر وہ ہراساں سی تھی۔ اس کے ہاتھ میں آلو کے چپس کا پیکٹ تھا اور وہ اپنی ماں کے منہ میں ایک ٹکڑا زبردستی ٹھونسنا چاہتی تھی۔ اس نے پیکٹ میری طرف بھی بڑھایا۔

بس اونتی پور پہنچ گئی۔ ڈرائیور نے بس روک دی۔ وہ ایک دم کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنی گیلی آنکھیں چھپانے کے لئے شال کا پلو چہرے پر نیچے تک ڈالا اور اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر بس سے دھیرے دھیرے نیچے اُتر گئی۔ وہ ہماری طرف مڑ کر بھی نہ دیکھ سکی۔ میں بس کی کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا، شاید یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ کس طرف جائے گی۔

بس چل پڑی۔ مجھے اپنے چہرے کا زخم دوبارہ یاد آیا اور خون کے دھبوں اور آنسوؤں سے گیلے رومال سے میں اپنے زخم کو دھیرے دھیرے دباتا رہا۔ میں جتنا اسے دباتا گیا، درد اتنا ہی بڑھتا گیا۔ میں بہت دیر تک یہی سوچتا رہا کہ شاید اسے میری نظر لگ گئی۔

وادی سے دور

گلے مل کر بہت دیر تک دونوں بلک بلک کر خوب روئے۔ کون کسے تسلی دے۔ ماں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا، "بیٹا! تمہاری ماں ابھی زندہ ہے......" وہ پھر رو پڑی کچھ دیر صحن کے ایک کونے میں وہ سر جھکائے غمگین بیٹھا رہا۔ گھر سے بھاگا نہ ہوتا تو "کاکا" بھی اسے جوان دیکھتے۔ دس سال کے بعد اپنے گھر گاؤں واپس آیا تھا۔ دس سال پہلے وہ آوارہ لڑکا تھا۔ تیز مزاج تھا اس کا۔ کسی کی بھی نہیں سنتا تھا۔ پڑھنے میں دل نہ لگا کر دن بھر گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتا۔ اس کے علاوہ دور کے چاچا کی لڑکی حنیفہ کے بغیر کھیلنا کودنا اسے اچھا نہ لگتا تھا۔ دونوں ایک ساتھ آٹھویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ بچپن سے ہی ایک ساتھ کھاتے پیتے، کھیلتے کودتے وہ اس جماعت تک پہنچے تھے۔ ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے تھے۔ ان کے والدین اور دوسرے رشتہ داران سے بہت خوش تھے۔

آٹھویں جماعت میں انور کا دل لکھنے پڑھنے سے زیادہ کھیلنے کودنے میں ہی لگتا تھا۔ ایک شام نہ معلوم کیوں اس کے کاکا نے ان دونوں کی پٹائی کی۔ حنیفہ دو ایک تھپڑ کھا کر بھاگ گئی اور انور کی خوب پٹائی ہوئی۔ مجید نے شکایت کی تھی۔ مجید نے نہ جانے ان دونوں کے بارے میں کاکا سے کیا الٹا سیدھا کہا تھا۔ اصل میں دونوں کو مجید سے نفرت تھی اور انھوں نے مجید کو اپنے ساتھ کھیلنے سے منع کیا تھا۔

اسی رات کو بڑی ہمت کر کے انور ایک کمبل اٹھا کر گھر سے چپ چاپ چل دیا۔ کمبل کسی ٹرک ڈرائیور کے حوالے کر کے وہ دوسرے دن پٹھانکوٹ پہنچا۔ اسی ڈرائیور نے اس کا کسی ہوٹل والے سے تعارف کرایا۔ اس ہوٹل کا مالک کشمیری ہی تھا۔ انور کو نوکری ملی۔

شہر کے ایک ہوٹل میں ایک گاؤں کا لڑکا طرح طرح کے کام کرنے لگا۔ بہت دونوں تک گھر کی یاد ستاتی رہی۔ دن میں ہوٹل کے کام میں مصروف رہتا اور رات کو مالک کے گھر پر کتنے ہی چھوٹے موٹے کام کرنے پڑتے۔ کچھ ہی دنوں میں وہ مالک کے بچّوں کے ساتھ گھل مل گیا۔ اسی کا ہم عمر رفیق آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا اور کلثوم چھٹی جماعت میں۔ وہ دونوں جب کتابیں لے کر پڑھتے تو انور کا بھی دل للچاتا۔ دن میں اسے فرصت نہیں ملتی تھی۔ رات کو رفیق کی کتابیں مانگ کر اپنے چھوٹے کمرے میں پڑھتا رہتا۔ کئی بار اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں۔ اسے اپنے والدین اور حنیفہ کی بہت یاد آتی۔ وہ پڑھائی چھوڑ کر گھر سے بھاگا کیوں؟ مالکن انور کا دکھ سمجھ گئی۔ اس نے کہا، "پڑھنا چاہتے ہو تو پڑھ لو۔ امتحان بھی دے دینا۔" بس پھر کیا تھا۔ انور دن بھر ہوٹل کا کام کرتا اور رات کو دِل لگا کر پڑھنے لگا۔ اس نے امتحان پرائیوٹ طور پر دیا۔ اس کے اچھے نمبر آئے۔ سبھی حیران ہوئے۔ مالک نے اسے سکول میں داخل کرا دیا۔ اب وہ صبح شام ہوٹل کے کام میں مالک کا ہاتھ بٹاتا تھا اور دن میں باقاعدگی سے سکول جاتا۔ اس نے میٹرک کر لیا۔ مالک نے اسے ہوٹل کا منیجر بنا دیا۔ رفیق کالج جانے لگا تھا۔

تنخواہ اچھی ملنے لگی تو علیحدہ رہنے لگا۔ اس کے مالک اس سے بہت خوش تھے۔ وہ اسے اپنے گھر گاؤں جانے کو بھی کہتے تھے لیکن وہ گیا نہیں۔ اب اس کے لئے مالک اور مالکن کا پیار ہی بہت تھا جو اسے اپنے بیٹے رفیق کی طرح چاہتے تھے۔ انور کی محنت اور اس کے اوساف سے وہ اتنے متاثر تھے کہ کلثوم سے اس کا رشتہ جوڑنا چاہتے تھے۔ کلثوم نے بھی میٹرک پاس کر لیا تھا۔ وہ آگے پڑھنا نہیں چاہتی تھی۔ انور کلثوم سے بہت محبت کرتا تھا مگر وہ اس تعلق کو شادی میں بدلنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ کسی طرح اس بات کو ٹالنا چاہتا تھا۔ انور حنیفہ کو اب تک نہیں بھولا تھا۔

اپنے گھر گاؤں کو چھوڑنے کے بعد اس نے چاہنے پر بھی اپنے گھر کوئی خط نہیں

لکھا تھا۔ اسے وہاں جانے کی بھی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ اس کے گھر والے بھی اس کی تلاش میں ناکام ہو کر اس کے گھر لوٹنے کی امید بھی چھوڑ بیٹھے تھے۔ ایک دِن انور کو اچانک اپنے گاؤں کا ایک آدمی ملا۔ اس سے یہ افسوناک خبر ملی کہ اس کے کاکا (والد) کا کچھ دن پہلے انتقال ہو گیا ہے۔ اس کو دلی صدمہ ہوا۔ اپنی ماں کی حالت کے تصور سے وہ خوف زدہ ہو گیا۔ دو ایک مہینے کے لئے وہ اپنے گھر گاؤں جانے کے لئے تیار ہوا۔ سامان باندھ کر ٹورسٹ بس سے وہ سرینگر پہنچا اور دوسرے دن اپنے گاؤں۔ انور کا صندوق اور بستر ایک قلی نے اس کے پرانے مکان کے صحن میں رکھ دیا۔ ماں کو دیکھتے ہی انور کا غم آنکھوں سے پھوٹ پڑا۔ ماں کا دکھ کچھ ہلکا معلوم ہونے لگا۔ ماں کے آنسوؤں میں اب مسرت اور اس کے چہرے پر زندگی کی چمک ابھرنے لگی۔ اس کی بجھی ہوئی مایوس آنکھوں کے سامنے اس کا جوان بیٹا کھڑا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں کے بہت سے مرد، عورتیں اور بچے جمع ہو گئے۔ ایک ایک کر کے سب نے انور کو گلے لگایا۔ بہت سے لوگوں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ کئی لوگوں کو انور پہچان بھی نہ سکا۔ انور کے کہنے پر ماں نے صندوق سے ٹافیاں چاکلیٹ نکال کر بچوں میں بانٹیں۔ بچے خوش ہو کر بھاگنے دوڑنے لگے۔ بڑے بوڑھوں نے انور سے اس کے کام دھندے کے بارے میں کئی باتیں پوچھیں۔

انور کی آنکھیں بھیڑ میں کسی کو دیکھنے کے لئے بیتاب تھیں۔ پچھلے چار گھنٹوں میں اسے دیکھ نہ پایا تھا۔ بیقراری بڑھتی گئی۔ وہ سب سے مل چکا تھا۔ 'آپا' اور سلطان چاچا بھی اسے گلے لگا کر خوب روئے تھے۔ آخر اس نے ہمت کر کے 'آپا' سے پوچھ ہی لیا:

"آپا، حنیفہ کو دیکھا ہی نہیں۔"

"گھر میں ہی ہے...... تو آیا اوپر کھڑکی سے دیکھ رہی تھی...... شرماتی ہے۔ ابھی بھیجتی ہوں۔"

"نہیں آپا، میں ہی جاؤں گا۔"

اس کے دل میں نہ جانے کتنے خواب مچل رہے تھے۔ تقریباً دس سال کے بعد وہ حنیفہ کو دیکھے گا۔ حنیفہ بھی اب پوری جوان ہوگی۔ کتنی خوبصورت ہو گی! اس کے پاس بیٹھ کر دس سال کی ساری باتیں ہوں گی۔ وہ پھر انھیں خوابوں میں کھو گیا جو خواب وہ گھر گاؤں سے دور اس انجانے شہر میں دیکھا کرتا تھا۔

شام کو بڑی مشکل سے گاؤں کے لوگوں سے فرصت ملی۔ صندوق کھول کر نیلے کاغذ میں لپٹا ایک بنڈل نکال کر بغل میں دبا کر وہ اپنے سلطان چاچا کے گھر پہنچا۔ کچھ گنگناتے ہوئے وہ اندھیری سیڑھیوں سے اوپر پہنچا۔ 'آپا' کو پکارا۔ حنیفہ ایک نیلا فرن پہنے ہاتھ میں ایک مٹی کا جلتا ہوا دیا لے کر دروازے تک آئی۔ انور کو دیکھتے ہی ایک دم سر سے پیر تک کانپی۔ انور کے رندھے ہوئے گلے سے گھبرائی ہوئی آواز میں یہ الفاظ سنائی دیے:

"حنیفہ تم ......" اور حنیفہ زور سے اس کے سینے سے لپٹ گئی۔ "بھیا......" اس کے ہاتھ کا دیا بجھ گیا۔ انور کی بغل میں دبا ہوا بنڈل بھی گر گیا" جسے چاچی نے اُٹھایا۔

چاچی نے انور سے پوچھا، "یہ کیا لائے ہو؟"

"یہ شلوار قمیض ہے۔" انور کے منہ سے لڑکھڑاتی آواز نکلی۔ چاچی زور سے ہنس پڑی۔ حنیفہ تھوڑا رک کر بولی، "یہ بھابی کے لئے لائے ہوں گے۔ میرے لئے فرن نہیں لائے ؟ رشتہ ہی کیا ہے؟"

انور کے دل کو دھکا سا لگا۔ اسے ایک دم خیال آیا کہ حنیفہ فرن پہنتی ہے، شلوار قمیض نہیں...... اُن دونوں تو ...... شلوار قمیض پہنتی تھی۔ اس کے کئی خیالوں پر پانی پھر گیا۔

اتنے میں آپا ایک آدھ سال کے چھوٹے سے بچے کو گود میں اٹھا کر لے آئی۔ انور سے پوچھا:

"میرے منّے بچے کے لئے کچھ نہیں لائے؟" حنیفہ تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی۔

انور سمجھ نہیں سکا۔ آپا کہہ رہی تھیں:

"یہ شرماتی ہے۔" انور دیکھتا رہا۔ کچھ پوچھنا چاہا لیکن ڈر کے مارے پوچھا نہیں۔ شاید آپا سمجھ گئیں۔ کہا

"مجید کو جانتے ہو نا؟ تمہارا دوست۔ اسی کے ساتھ حنیفہ کی شادی......"

دوسرے دن اپنی ماں کو جیسے تیسے راضی کر کے تیسرے دن دونوں ماں بیٹے ٹورسٹ بس سے پٹھانکوٹ چلے آئے۔ اسے لگا جیسے وہ ہمیشہ کے لئے کشمیر سے وداع ہو رہا تھا۔ اپنے گھر گاؤں کو ہی نہیں ساری وادی کو بھولنے کے لئے۔



Prof Omkar Koul has held various positions in Govt. of India. He was Director (1999-2000), Professor-cum-Deputy Director of the Central Institute of Indian languages Mysore (1994-1999), Professor and Coordinator, Faculty of Languages, LBS National Academy of Administration, Mussoorie (1987-1994), and Principal, Northern Regional Language Centre (CIIL), Patiala (1971-1987). He is presently Chairman of the Indian Institute of Language Studies. His main areas of interest are general linguistics, language education, communication, and sociolinguistics. He has worked extensively on Kashmiri, Hindi, Urdu and Punjabi languages. He has authored and edited a large number of books and research papers published in India and abroad. His publications include *Linguistic Studies in Kashmiri* (1977), *Language in Education* (1983), *Punjabi Phonetic Reader* (co-author 1980), *Urdu Phonetic Reader* (1980), *Kashmiri: A Sociolinguistic Survey* (1983), *Aspects of Kashmiri Linguistics* (co-editor, 1984), *Topics in Hindi Linguistics* (vols. II 1981, III 1992, IV 1999), *An Intensive Course in Kashmiri* (1985), *Modes of Address and Pronominal Usage in Punjabi* (1989), *Punjabi Manual* (Vols I-III, co-author 1990), *Urdu Script: Reading and Writing* (1991), *Punjabi Language and Linguistics: An Annotated Bibliography* (1992), *A Dictionary of Kashmiri Proverbs* (1992, 2006), *Language Development and Administration* (1994), *Effective Communication Skills* (1994), *An Intermediate Course in Kashmiri* (1995), *Kashmiri: A Cognitive-Descriptive Grammar* (co-author, 1997), *Kashmiri Language, Linguistics and Culture: An Annotated Bibliography* (2000), *Topics in Kashmiri Linguistics* (2002), *Studies in Kashmiri Linguistics* (2005), *Modern Kashmiri Grammar* (2006) etc. He is founder editor of the journal *South Asian Language Review* (1991-).

He writes short stories and essays in Kashmiri, Hindi and English occasionally. A collection of his short stories entitled *Mulaaqaat* written in Hindi was awarded a prize by Govt. of India in 2003. The book was translated and published under the same title in Kashmiri earlier. This book has been translated in Urdu by Mr. Abdul Mughni, a well-known translator in Urdu, who has translated a large number of books from other languages into Urdu.